رمضان، شوال
علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ
مئی 2021

ماہ نامہ ذوق و شوق کراچی

J.

FRAGRANCES

POUR FEMME

An elusive fragrance, J. Pour Femme reflects the persona and charisma of a woman who is determined and self reliant. It is the best pick of this summer, for those who value their uniqueness and individuality.

Available on the App Store

GET IT ON Google Play

Shop online at www.junaidjamshed.com J.Fragrances J.JunaidJamshed FragrancesJ J.Fragrances

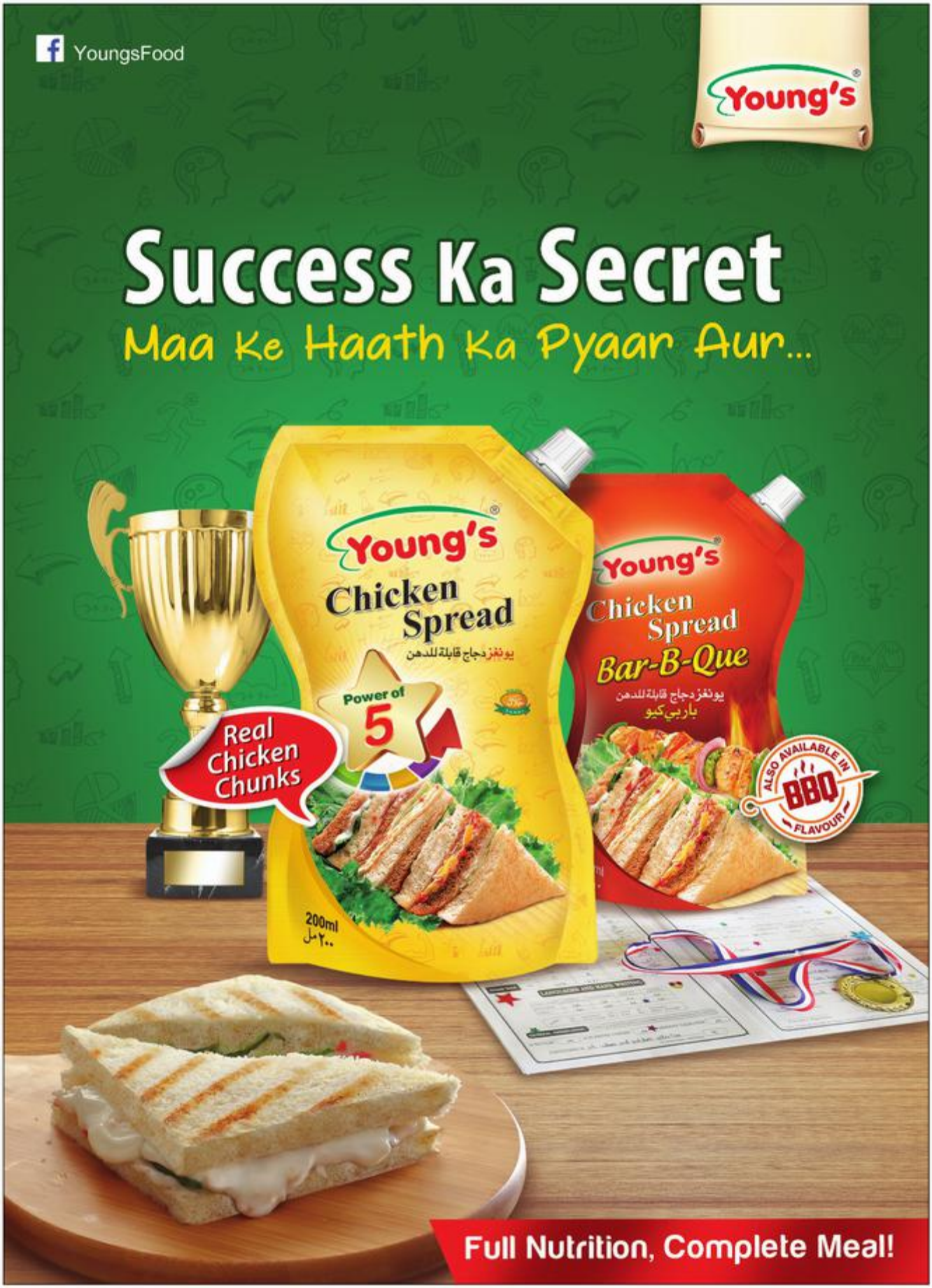

YoungsFood
Young's
Success Ka Secret
Maa Ke Haath Ka Pyaar Aur...
Young's
Chicken Spread
يونغز دجاج قابلة للدهن
Power of 5
Real Chicken Chunks
200ml
٢٠٠ مل
Young's
Chicken Spread
Bar-B-Que
يونغز دجاج قابلة للدهن
باربي كيو
ALSO AVAILABLE IN BBQ FLAVOUR
Full Nutrition, Complete Meal!

Shangrila
THE FOOD EXPERTS!
IMLI GINGER SAUCE
BAR-B-Q SAUCE
GREEN CHILLI SAUCE
GARLIC CHILLI SAUCE
SHANGRILA KETCHUP AND SAUCES
TASTY!
DELICIOUS!
KHAANON KAY MUST HAVES!
TOMATO KETCHUP
Tantalize your taste buds
SMART PACK
www.shangrila.com.pk
shangrilaPakistan
ShangrilaPakistan

پیغامِ الٰہی جل جلالہ

عبدالعزیز

(مفہوم آیت :87 از سورہ بقرہ)

اور (اے یہودیو!) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی، ان کے بعد باری باری رسول بھیجتے رہے اور (پھر) ہم نے عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کو (نبوت کے) واضح دلائل دیے اور ہم نے روح القدس کے ذریعے ان کی تائید کی، کیا (تعجب کی بات نہیں کہ اس پر بھی تم سرکشی کرتے رہے اور) جب کبھی کوئی پیغمبر تمھارے پاس ایسا حکم لے کر آیا جسے تمھارا دل نہ چاہتا تھا تو تم نے (ان نبیوں کی بات ماننے میں) تکبر کرنا شروع کر دیا، سو بعض (انبیائے کرام) کو تم نے جھوٹا بتلایا اور کچھ کو قتل کرتے رہے ہو۔"

عزیز دوستو! اس آیت شریفہ میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی ایک بہت ہی بُری عادت بیان فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی ہدایت کے لیے ہمیشہ اچھا انتظام کیا، مثلاً ان کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات شریف دی، جس میں ان یہودیوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم تھے۔ ان کے بعد اور رسول بھی بھیجے اور اِسی سلسلے کے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی کھلے کھلے معجزات دیے جو اُن کے نبی ہونے کے واضح دلائل تھے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ مٹی سے پرندے کی صورت بنا کر اُس میں پھونک دیتے، جس سے پرندہ اڑنے لگتا۔ پیدائشی اندھے اور برص کے بیمار کو اچھا کر دیتے اور روح القدس یعنی جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے ان کی تائید کی۔ یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور اُن کی حفاظت کرتے رہتے تھے، لیکن جب بھی کوئی نبی ان یہودیوں کو اللہ تعالیٰ کے ایسے حکم بتاتا جو اُن یہودیوں کے دلوں کو نہ بھاتے تو یہ یہودی یا تو اُس نبی کو جھوٹا بتلاتے یا پھر قتل کر دیتے، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ کے ایسے حکم بتائے جن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ کتاب تورات شریف کے بعض حکم منسوخ کر دیے گئے تو یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن ہو گئے اور اُنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بہت ستایا اور قتل کرنے کے درپے ہو گئے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے انھیں آسمان پر اُٹھا لیا۔ اسی طرح ان سے پہلے دیگر انبیائے کرام مثلاً حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کو اُن یہودیوں نے قتل کیا۔

عزیز دوستو! دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یہودیوں جیسی بُری صفات سے بچائے اور تمام انبیائے کرام علیہم السلام کو یکساں طور پر مانتے ہوئے اپنے حضرت محمد ﷺ کے ذریعے بھیجے گئے اپنے تمام حکموں پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔

پیغامِ نبوی ﷺ

ارشد علی نواب شاہی

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کے سامان کو نہ مذاق میں لے اور نہ حقیقت میں بلا اِجازت لے۔"

(ابوداود، الرقم: ۵۰۰۳، عن یزید بن سعید)

عزیز ساتھیو! ہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ کہیں زیادہ رہتے ہیں اور کہیں کم۔ جیسے گھر میں ہمارا رہنا زیادہ ہوتا ہے، اسکول میں اس سے کم۔ کھیل کے میدان میں اس سے کم۔

ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے ہمیں ایک دوسرے کی چیزوں ضرورت بھی پڑ جاتی ہے۔ مثلاً اسکول میں کبھی پنسل کی، کبھی قلم کی، سیاہی کی یا کاپی کی، اسی طرح گھر میں بھی، تو ایسے موقع پر ہمارے پیارے نبی ﷺ کی مبارک تعلیم ہے کہ ہم کسی کی چیز بغیر اُس کی اجازت کے استعمال نہ کریں۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی بھائی بہن یا دوست کی چیز ہم مذاق مذاق میں استعمال کر لیتے ہیں اور بعض مرتبہ مذاق میں تو اِستعمال نہیں کرتے، بل کہ ضرورت پڑتی ہے تو اِستعمال کرتے ہیں، ایسے دونوں موقعوں پر ہم بغیر اجازت کے دوسروں کی چیز استعمال نہ کریں، کیوں کہ اگر ہم کسی کی چپل پہن کر چلے گئے تو جس کی چپل ہے وہ بے چارہ تکلیف میں رہے گا۔

اس کے علاوہ کچھ چیزیں تو ہمیں ایک دوسرے کی استعمال ہی نہیں کرنی چاہییں، جیسے ٹوتھ برش وغیرہ، ہر بچہ اور بچی اپنا اپنا برش استعمال کرے۔

غرضے کہ ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے کہ جس سے دوسروں کو تکلیف اور زحمت ہو، نہ مذاق میں اور نہ جان بوجھ کر۔

عزیز ساتھیو! ہمیں خود بھی ان باتوں پر عمل کرنا چاہیے اور اپنے دوستوں وغیرہ کو بھی یہ باتیں بتانی چاہییں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو کامل ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین

علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ

ماہنامہ

ذوق و شوق

کراچی

زیرِ سرپرستی:

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

رمضان، شوال ۱۴۴۲ ہجری | جلد: 16

شمارہ: 05

ناشر — محمد عارف رشید

مجلس ادارت

- مدیر — عبدالعزیز
- معاون — محمد طلحہ شاہین

مجلس مشاورت

پروفیسر محمد احمد خان صاحب

راشد علی نواب شاہی

سرورق السٹریٹر — سید ناصر

آرٹسٹ — قیصر شریف

کمپوزر — سعد علی

نگران ترسیل — منور عمر

اس رسالے کی تمام آمدنی تعلیم و تبلیغ اور اصلاحِ امت کے لیے وقف ہے۔

قیمت 70

سالانہ خریداری بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک 1000/=

بذریعہ عام ڈاک 750/=

ماہنامہ ذوق و شوق میں اشتہار شائع کرنے کا مطلب تصدیق ہے نہ سفارش۔ یہ صرف عوام کو مطلع کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مصنوعات کے بارے میں قارئین خود تحقیق فرمالیں۔

خط و کتابت کا پتہ:

ماہنامہ ذوق و شوق پی۔ او۔ بکس 17984 پوسٹ کوڈ 75300 گلشن اقبال، کراچی

Email: zouqshouq@hotmail.com

zouq shouq/ذوق شوق

اشتہارات اور سالانہ خریداری کے لیے رابطہ کریں

0213-4990760, 0341-4410118

What's app: 0324-2028753

دفتری اوقات: صبح 8:00 تا 1:00 دوپہر 2:30 تا 6:00

صفحہ	عنوان	مصنف
06	سیرت کہانی ۲۵	عبدالعزیز
08	بلاعنوان ۲۵	عبدالوہاب حیدر
15	خاندانی آمیزہ	جہانگیر عالم
17	سوال آدھا، جواب آدھا ۲۰ (کھیل)	الطاف حسین
18	جذبہ جواں، منزل آساں	حافظ محمد اشرف
20	سود، اعلانِ جنگ	محمد ذیشان فرخ
23	بدلتے موسم (نظم)	محمد شریف شیوہ
24	جھوٹوں کے جھوٹے ۱۲	حافظ محمد دانش عارفین حیرت
27	وہ عظیم تھا	الطاف حسین
29	خوشیاں عید کی	صبا نزہت
32	مقابلہ خوش خطی ۸ (کھیل)	اشتراک البدر اسکول
33	تنگی کے بعد آسانی	؟۔؟
34	میرے اچھے بابا	قرۃ العین ہاشمی
37	قرآن کورس ۹ (کھیل)	سعد علی چھیپا
38	منے کی عید	وزیر ظفر
42	ادیب صاحب	تماضر ساجد
44	نئے لکھاری	قارئین
46	ذوق معلومات ۲۳ (کھیل)	ابو غازی محمد
47	ذوق مصوری	قارئین
48	اسکول فوبیا	ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی

پبلشر محمد عارف رشید نے بچوں کی تعلیمی و تربیتی ترقی و اصلاح کی خاطر ابن حسن پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

PARADISE BOOKS DISTRIBUTORS

Karachi: J-73, UNIT-1, GROUND FLOOR, OFF ALLAMA IQBAL ROAD, PECHS BLOCK-2, KARACHI. 021-34314981

LAHORE: SIDDIQUE MANAZIL, 2ND FLOOR, 40-ABBOT ROAD, STREET NEON PRINCE, LAHORE. 051-48430042

RAWALPINDI: OFFICE NO 2, FIRST FLOOR, STAR PLAZA, PARADISE HOUSE, RAWALPINDI. 042-3629701

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید ہے آپ سب بخیر وعافیت ہوں گے۔

رمضان المبارک کا مہینا تیزی سے بھاگا چلا جارہا ہے اور اُس کا پیچھا کرتی عید تیزی سے دوڑی چلی آرہی ہے۔

آپ نے کبھی غور کیا کہ یہ عید رمضان کے ختم ہوتے ہی کیوں آدھمکتی ہے؟ کیا کہا؟ نہیں پتا! کوئی بات نہیں، ہر ایک کو ہر بات کا پتا ہونا ضروری بھی نہیں۔ ہمیں بھی ہر بات نہیں پتا۔

ہمیں تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ تربوز کو چیک کرنے کے لیے اس پر ہاتھ مارنے سے کیا ہوتا ہے؟ کس طرح کی آواز نکلنے سے پتا چلتا ہے کہ تربوز لال نکلے گا؟ یہ ہمیں ہمارے اندرون سندھ سے آئے بھانجے نے بتایا کہ ماموں! اگر آواز دھپ دھپ آئے تو تربوز اِن شاء اللہ! لال نکلے گا اور اگر آواز تھپ تھپ آئے تو اِس کا مطلب ہے کہ تربوز کے لال نکلنے کے امکانات کم ہیں۔

خیر، ہم آپ سے پوچھ رہے تھے کہ رمضان کے ختم ہوتے ہی عید کیوں آجاتی ہے؟

تو اِس کا ایک جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر زندگی رمضان کی طرح پرہیزگاری کے ساتھ نیک عمل کرتے ہوئے گزرے تو زندگی کے ختم ہوتے ہی عید کا سماں ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ!

اور رمضان المبارک کا مقصد بھی تو یہی بتایا گیا ہے نا کہ ہم میں تقویٰ پیدا ہوجائے، جس کے ذریعے ہم رمضان کے علاوہ بھی پرہیزگاری کے ساتھ نیک عمل کرنے کے عادی رہیں گے اور یوں ہماری زندگی کا مقصد اصلی پورا ہوجائے گا۔

رمضان کی ان آخری ساعتوں میں جب آپ اپنے لیے دعائیں کریں تو ہمیں بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا، اسی طرح دنیا بھر کے مسلمانوں کی خیر و بھلائی کے لیے ضرور دعائیں کیجیے گا، خاص کر فلسطین کے مسلمانوں کے لیے۔

اور ہاں، اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم چھوٹوں سے عیدی لیں گے، لہٰذا ہمیں آپ کی طرف سے عیدی کا اِنتظار رہے گا!

عبدالعزیز

سیرت کہانی ۲۵

عبدالعزیز

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مبارک زندگی اور سیرت کے اہم واقعات پر مبنی ایک پیارا سلسلہ۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جبریل امین علیہ السلام نے آ کر قریش کے اس مشورے کی حضور ﷺ کو اِطلاع دے دی اور یہ مشورہ دیا کہ آپ یہ رات اپنے مکان میں نہ گزاریں۔

(خصائص کبریٰ، ج:۱،ص:۱۸۵)

لہٰذا جب رات کا وقت آیا اور تاریکی چھا گئی تو قریش نے اپنے فیصلے کے مطابق آ کر آپ ﷺ کے مکان کو گھیر لیا کہ جب آپ سو جائیں تو آپ پر حملہ کر دیں۔ آپ ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حکم دیا کہ میری سبز چادر اُوڑھ کر میرے بستر پر لیٹ جاؤ اور ڈرنا مت، تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

قریش کے لوگ اگرچہ آپ ﷺ کے جانی دشمن ہو گئے تھے، لیکن آپ کو صادق اور امین سمجھتے تھے اور اپنی اَمانتیں آپ ﷺ ہی کے پاس رکھواتے تھے۔ آپ ﷺ نے وہ سب امانتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیں کہ صبح یہ امانتیں لوگوں تک پہنچا دینا۔

ابو جہل ملعون باہر کھڑا ہوا ہنس ہنس کر لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ محمد کا یہ گمان ہے کہ اگر تم ان کی بات مانو گے تو دنیا میں عرب اور عجم کے بادشاہ بنو گے اور مرنے کے بعد تمھیں جنت ملے گی اور اگر اُن پر ایمان نہیں لاؤ گے تو دنیا میں ان کے ماننے والوں کے ہاتھ سے قتل ہو جاؤ گے اور مرنے کے بعد جہنم میں جلو گے۔

نبی اکرم ﷺ گھر سے ایک مٹھی مٹی لیے ہوئے نکلے اور فرمایا:

''ہاں، میں یہی کہتا ہوں اور تو بھی انھی میں سے ایک ہوگا کہ دنیا میں میرے ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہوگا اور مرنے کے بعد جہنم میں جلے گا۔''

پھر اُس ایک مٹھی مٹی پر سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیات فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ تک پڑھ کر اُن کے سروں پر ڈال دی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور آپ ﷺ ان کے سامنے سے گزر گئے اور کسی کو نظر نہ آئے۔

(عیون الاثر، ج:۱،ص:۱۷۹)

آپ ﷺ ان کے سامنے سے نکل کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر گئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو لے کر جبل ثور کا راستہ لیا اور وہاں جا کر غار میں پناہ لی۔ اسی دوران میں ایک شخص آپ ﷺ کے مکان کے پاس سے گزرا تو قریش کے لوگوں سے پوچھا:

''تم لوگ کیوں کھڑے ہو اور کس کا اِنتظار کر رہے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''ہم محمد کے منتظر ہیں کہ وہ باہر نکلیں تو اُنھیں قتل کر دیں۔'' (نعوذ باللہ) اس شخص نے کہا:

''خدا تمھیں ناکام کرے! محمد تو تمھارے سروں پر مٹی ڈال کر گزر بھی گئے۔''

جب صبح ہوئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بستر سے اٹھے تو قریش کہنے لگے:

''خدا کی قسم! اس شخص نے ہم سے سچ کہا تھا۔''

اور شرمندگی کے ساتھ حضرت رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

''محمد کہاں ہیں؟''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا:

''مجھے نہیں معلوم۔''

(البدایہ والنہایہ، ج:۳،ص:۱۷۶)

حضور ﷺ جب مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے تو ایک ٹیلے پر سے ایک نظر مکے کو دیکھا اور یہ فرمایا:

''اللہ کی قسم! تُو اللہ کی سب سے بہتر زمین ہے اور سب سے زیادہ اللہ

کے نزدیک محبوب ہے، اگر میں تجھ سے نکالا نہ جاتا تو نہ نکلتا۔" (ترمذی)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"تو کیا ہی پاکیزہ شہر ہے اور مجھے بہت ہی محبوب ہے۔ اگر میری قوم مجھے تجھ سے نہ نکالتی تو میں دوسری جگہ سکونت اختیار نہ کرتا۔" (زرقانی، ج:۱، ص:۳۲۸)

اس حدیث کی وجہ سے اکثر علمائے کرام فرماتے ہیں کہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ سے افضل ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بڑی صاحب زادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے سفر کے لیے ناشتا تیار کیا، جلدی میں بجائے رسی کے اپنا پٹکا پھاڑ کر ناشتا دان باندھا، اس وقت سے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا "ذات النطاقین" کے نام سے مشہور ہوئیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن ابوبکر، جو جوان تھے، وہ دن بھر مکے میں رہتے اور رات کو آ کر قریش کی خبریں انھیں بتا جاتے اور عامر بن فہیرہ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے غلام، جو بکریاں چرایا کرتے تھے، عشا کے وقت آ کر نبی ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بکریوں کا دودھ پلا جاتے۔

(البدایہ والنہایہ، ج:۳، ص:۱۸۴)

آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن اریقط دولی پر جو کافر تھا، اعتماد کرتے ہوئے اسے راہ بری کے لیے اجرت پر مقرر کیا کہ وہ ایسے راستے سے مدینہ لے جائے کہ جو راستہ مشہور نہ ہو۔ دونوں اونٹنیاں اس کے حوالے کر دیں کہ تیسرے روز جبل ثور آ کر ہمیں مدینہ لے جائے۔ جب آپ ﷺ غار کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کبھی آپ کے آگے چلتے تو کبھی پیچھے، کبھی دائیں چلتے تو کبھی بائیں۔ بالآخر آپ ﷺ نے دریافت فرما ہی لیا:

"اے ابوبکر! یہ کیا ہے، کبھی آگے چلتے ہو تو کبھی پیچھے؟"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسول! جب یہ خیال آتا ہے کہ کہیں پیچھے سے تو کوئی آپ کی تلاش میں نہیں آ رہا تو پیچھے چلتا ہوں اور جب یہ خیال آتا ہے کہ کہیں گھات لگائے تو نہ بیٹھا ہوگا تو آگے چلتا ہوں۔"

آپ ﷺ نے فرمایا:

"اے ابوبکر! اس سے تمھارا یہ مقصد ہے کہ تم قتل ہو جاؤ اور میں بچ جاؤں؟"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "جی ہاں اے اللہ کے رسول! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے، میں یہی چاہتا ہوں کہ آپ بچ جائیں اور میں قتل ہو جاؤں۔" جب غار پر پہنچے تو عرض کیا:

"یا رسول اللہ! ذرا ٹھہریے، میں اندر جا کر آپ کے لیے غار کو صاف کر لوں۔"

(فتح الباری، ج:۷، ص:۱۸۵)

چناں چہ پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غار میں داخل ہوئے اور پھر آپ ﷺ غار میں داخل ہوئے۔ اللہ کے حکم سے ایک مکڑی نے غار کے دہانے پر جالا بُن دیا۔

(طبقات ابن سعد)

دوسری طرف قریش کے لوگوں کو جب مکان میں آپ ﷺ کی جگہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سونے کا علم ہوا تو اُنھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ حضور کہاں ہیں؟ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "مجھے علم نہیں۔" تو اُس وقت وہ آپ ﷺ کی تلاش میں ہر طرف دوڑے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار تک جا پہنچے، لیکن غار کے منہ پر مکڑی کا جالا دیکھ کر کہنے لگے:

"اگر اِس میں جاتے تو غار کے منہ پر مکڑی کا جالا باقی نہ رہتا۔"

(فتح الباری، ج:۷، ص:۱۸۴)

اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ غار میں پناہ گزین ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ ﷺ کے چہرے کے سامنے ایک درخت اُگ آیا اور جنگلی کبوتر کی جوڑی نے آ کر انڈے دے دیے۔ مشرکین جب ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار تک پہنچے تو کبوتروں کے گھونسلے دیکھ کر واپس ہو گئے۔

رسول ﷺ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ہم سے دور کر دیا۔"

(طبقات ابن سعد، ج:۱، ص:۱۵۴)

.....(جاری ہے).....

''کیا آپ میری کہانی لکھیں گے؟''

اس آواز پر میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ ایک درمیانی عمر کا شخص قدرے پریشان حال میرے سامنے کھڑا تھا۔

''جی میں سمجھا نہیں آپ کی بات؟''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ میری کہانی لکھیں گے؟''

انھوں نے دوبارہ اپنی بات دہرائی، لیکن میں ابھی بھی سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں تین چار روز سے یہاں آپ کو لکھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے لگا شاید آپ لکھاری ہیں، اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کیا آپ میری کہانی لکھیں گے؟''

ان کی بات سن کر میں مسکرایا اور قدرے جھینپ کر کہنے لگا:

''اب اتنا بڑا لکھاری بھی نہیں کہ آپ کی کہانی لکھ سکوں۔ میں تو بس ایسے ہی ہلکی پھلکی تحریریں لکھتا ہوں بچوں کے لیے۔''

(اور میری تو اپنی کئی تحریریں سالوں سے ادھوری رکھی ہیں، سستی کی وجہ سے، انھیں ہی مکمل کرلوں تو بڑی بات ہے، چہ جائے کہ کسی اور کی کہانی لکھوں۔)

''میری کہانی بھی بچوں کے لیے ہی ہے۔'' انھوں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کسی رسالے کے مدیر تو نہیں؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

وہ ہنس دیے۔

''ارے نہیں، میں تو یہاں تین چار دن سے ہسپتال میں رکا ہوا ہوں۔''

انھوں نے پارک کے سامنے بنے ہسپتال کی طرف اشارہ کیا۔

''میرا بیٹا یہاں داخل ہے، اس کا اپنڈکس کا آپریشن ہوا ہے، کل تک شاید ہسپتال سے چھٹی مل جائے۔''

''اوہ! اب کیسی طبیعت ہے آپ کے بیٹے کی!؟ میں نے پوچھا۔

''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، بہتر ہے۔'' انھوں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''میرا گھر سامنے گلی میں ہی ہے۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف کہیے گا۔''

''شکریہ بیٹا!'' اس دوران میں وہ میرے برابر میں بیٹھ چکے تھے۔ میں بھی اپنی فائل بند کر کے ان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''جی تو کیا کہانی ہے آپ کی؟''

''کہانی تو میں نے ویسے ہی کہہ دیا ہے، اصل میں تو ایک احساس ہے۔ اس احساس کو لفظوں میں ڈھال کر کہانی تو آپ بنائیں گے۔'' وہ مسکرائے۔

(لو جی..... یہاں اپنے خیالات کو لفظوں میں ڈھال کر کہانی بنانی ہو تو ہوش ٹھکانے آجاتے ہیں۔ ویسے کیا میں شکل سے اتنا بڑا لکھاری لگتا ہوں کہ لوگ دور دُور سے مجھ سے کہانیاں لکھوانے آئیں۔)

''آپ کہاں رہتے ہیں؟''

اوٹ پٹانگ سوچتے ہوئے بے دھیانی میں میرے منہ سے نکلا۔

(پتا تو چلے کہ لوگ کتنی دور دُور سے آتے ہیں کہانیاں لکھوانے۔)

''میں شمالی کراچی کا رہائشی ہوں۔''

(اوہ، اتنا بھی دور نہیں ہے، بیس پچیس منٹ کا فاصلہ ہے بس۔)

''کیا کہانی ہے آپ کی؟''

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''میں بس آپ کو اپنا ایک خیال بتاؤں گا، اسے کہانی آپ کو بنانا ہے۔ آپ لکھاری لوگ ویسے بھی رائی کا پہاڑ بنانے کے ماہر ہوتے ہیں۔''

''مذاق اچھا کر لیتے ہیں آپ!'' میں مسکرایا۔

پھر وہ بولنے لگے، میں سننے لگا۔

وہ ایک عام سی بات بتا رہے تھے۔ ہسپتال میں ہونے والا ایک عام سا واقعہ، جس میں بچوں کی دل چسپی کا کوئی سامان بھی نہیں تھا اور کوئی ایسا منفرد اور اچھوتا

بہترین عنوان تجویز کرنے پر 250، دوسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 150، تیسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 100 روپے انعام دیا جائے گا۔ ''بلاعنوان'' کے کوپن پر عنوان تحریر کر کے ارسال کریں۔

عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 31 مئی 2021 ہے۔

نوٹ: کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابل قبول نہ ہوگا۔

خیال بھی نہیں تھا کہ میں اس خیال کو کہانی بنا پاتا، وہ بھی بچوں کے لیے۔

مجھے بس ان کی پوری بات سن کر اُنھیں خدا حافظ کہنا تھا۔

مگر پھر اُن کی کہانی نے ایک رخ بدلا۔

اور بظاہر عام سا لگنے والا وہ واقعہ خاص ہونے لگا۔ وہ بول رہے تھے، میں سن رہا تھا۔

ان کے لہجے کا اُتار چڑھاؤ میرے دل پر اثر کرنے لگا۔ ان کی بھیگی آواز سے میری آنکھیں بھیگنے لگیں اور پھر اچانک ہی انھوں نے بات ختم کردی۔

میں جیسے ایک ٹرانس سے باہر آیا اور اُن کی طرف دیکھنے لگا۔

''بس یہی کہنا تھا مجھے۔''

میں بالکل خاموش تھا، کچھ کہہ ہی نہیں پا رہا تھا۔

تھوڑی دیر خاموش بیٹھنے کے بعد وہ اٹھے اور دو، چار رسمی الوداعی جملے کہہ کر چل دیے۔ میری خاموش نظروں نے پارک سے ہسپتال کے اندر داخل ہونے تک ان کا پیچھا کیا، پھر میں بھی اٹھا اور سوچوں میں گم گھر واپس آ گیا۔

میں یہ کہانی نہیں لکھنا چاہتا، کیوں کہ ان کی کہانی کے شروع میں مجھے لگا کہ یہ ایک عام سا واقعہ ہے اور آخر میں بھی میرا خیال یہی ہے کہ میں یہ کہانی نہ لکھوں، اس لیے کہ اس عام سے واقعے کا جو رُخ وہ دکھانا چاہ رہے ہیں ان کے اس احساس کو میں لفظوں میں بیان کر ہی نہیں سکتا، کبھی بھی نہیں!

لیکن مجھے یہ کہانی لکھنی ہے، رسالے کے لیے نہیں، اس شخص کے لیے بھی نہیں، آپ سب کے لیے بھی نہیں۔

تو پھر کس لیے؟

مجھے یہ کہانی اپنے لیے لکھنی ہے صرف اپنے لیے۔

حالاں کہ میں جانتا ہوں کہ میں نہیں لکھ پاؤں گا۔

قلم پر گرفت کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو، کچھ احساسات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ لکھاری کا قلم انھیں لفظوں کی زبان دینے سے قاصر رہتا ہے۔

اور پھر یہ ضروری تو نہیں کہ لکھاری ہی سب کچھ لکھے۔ کچھ باتیں قارئین کو خود ہی سمجھ لینی چاہییں اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے قارئین اتنے سمجھ دار اور اِتنے زیرک ضرور ہیں کہ وہ بات بھی سمجھ جائیں گے جو لکھاری سمجھانا تو چاہتا ہے، مگر لکھ نہیں پاتا۔

تو پھر شروع کرتے ہیں اس شخص کی کہانی، اسی کی زبانی.....

.....☆.....

صبح کا وقت تھا۔ ہسپتال کے ایمرجنسی ہال میں ڈاکٹر، نرسیں، وارڈ بوائے، مریض اور اُن کے تیماردار، سب اپنی اپنی جگہ مصروفِ عمل تھے۔ میں بھی اپنے بیٹے کے سرہانے بیٹھا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس کی آنکھ لگی تھی۔ ساری رات وہ درد سے تڑپتا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آج کسی وقت اس کا اپنڈکس کا آپریشن ہوگا۔

اچانک ایمرجنسی ہال کی پُرسکون فضا میں ایک ہلچل سی ہوئی۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک شخص کمبل میں کسی بچے کو لپیٹے

دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب!'' بچے کو خالی بستر پر لٹا کر قدرے گھبرائی آواز میں اس شخص نے ڈاکٹر کو پکارا۔

''کیا ہوا ہے اسے؟'' ڈاکٹر جلدی سے آگے بڑھا اور بچے کو چیک کرنے لگا۔

''یہ سیڑھیوں سے..... گرا ہے..... لڑھکتا ہوا..... کافی اونچائی سے۔'' اس شخص نے رک رک کر اپنی بات مکمل کی۔

چار یا پانچ سال کا چھوٹا سا بچہ تھا۔ ڈاکٹر نے پہلے تو بچے کو خود ہی چیک کیا، پھر بستر کے ساتھ منسلک مشینوں کے ذریعے بچے کو چیک کیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے اس شخص کو دیکھا۔

''یہ بچہ کون ہے؟''

''مم..... میرا..... بیٹا۔'' اس شخص نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''یہ بچہ تو فوت ہو چکا ہے۔'' ڈاکٹر نے نرمی سے ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔

''جج..... جی..... ڈاکٹر صاحب!؟'' شاید اُس شخص نے سنا نہیں تھا یا ایسی بات وہ سننا نہیں چاہتا تھا، جیسے اس کی قوت سماعت مفلوج ہو گئی تھی۔

''یہ بچہ فوت ہو چکا ہے۔'' ڈاکٹر نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

ایک دم ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ہال میں موجود سبھی لوگ ادھر متوجہ ہو گئے تھے۔

''ڈ..... ڈاکٹر صاحب! آپ..... آپ..... چیک تو کریں۔''

ہال کے گھمبیر سناٹے میں اس کی سرگوشی جیسی کانپتی ہوئی آواز بھی سب نے صاف سنی۔

''بھائی! یہ بچہ یہاں آنے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔''

ڈاکٹر نے نرم آواز میں جواب دیا۔

ڈاکٹر کی آواز کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ گونجی، سبھی یک دم مڑے۔

ہال کے بیچ و بیچ ایک برقعہ پوش عورت گھٹنوں کے بل گری ہوئی تھی۔

''اللہ! میرا بچہ!''

گھٹی گھٹی چیخ نما آواز میں درد ہی درد تھا۔ یہ عورت اس بچے کی ماں تھی اور ڈاکٹر کا جملہ جیسے ہی اس کے کانوں میں پڑا وہ وہیں بے دم ہو کر گھٹنوں کے بل گر گئی تھی۔

میں نے غور کیا تو بچے کو اُٹھا کر لانے والے کے ساتھ ایک بڑی عمر کا شخص اور تھا، جو سر پکڑے وہیں بستر پر بیٹھا تھا، شاید وہ اس بچے کا دادا تھا۔

قدرے بڑی عمر کی ایک عورت اس گری ہوئی ماں کو سنبھالنے کی کوشش میں خود بھی ہلکان ہو رہی تھی، شاید وہ بچے کی دادی تھی۔

''صبر کر..... حوصلہ رکھ بیٹی! اٹھ جا..... سنبھال خود کو..... ہسپتال ہے یہ!''

مگر اُس ماں کی ٹانگوں سے جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ ہال میں جامد خاموشی تھی۔ صرف اس ماں کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخوں کی آواز وقفے وقفے سے آ رہی تھی۔ وہ خود کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی، مگر اُس میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس پورے منظر کو اُس ماں کے غم نے جیسے باندھ دیا تھا۔ ماں کے دل سے نکلنے والی غم کی لہریں اس ہال میں موجود ہر شخص کے دل پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔

تیماردار اپنے مریض کو اور مریض اپنے مرض کو بھول کر اُسی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ افسردگی جیسے اس پورے منظر میں انڈیل دی گئی تھی۔

اس شخص نے کمبل سمیت بچے کو بازوؤں میں اٹھایا۔

''چلیں ابا!؟'' اس کے لبوں سے مدھم سی آواز نکلی۔

بستر پر بیٹھے دادا نے سر اُٹھایا۔ چہرہ آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھا، تسلی کے لیے نہیں، سہارے کے لیے۔ ایک بیٹے کو باپ نے بازوؤں میں اٹھایا ہوا تھا اور ایک باپ نے بیٹے کے کندھے کا سہارا لیا ہوا تھا۔ مردہ قدموں کے ساتھ چلتے وہ ہال سے باہر جانے لگے۔ دادی نے بھی جیسے تیسے ماں کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور گویا گھسٹتے ہوئے وہ بھی باہر کی جانب چل دیں۔

رکے ہوئے منظر میں جیسے جان پڑنی شروع ہوئی۔

کچھ کمزور دل عورتوں کی سسکیاں بلند ہوئیں۔

ماؤں نے اپنے بیمار بچوں کو اپنی گودوں میں سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ موت کا انجانا خوف ان کے دلوں پر بھی دستک دے رہا تھا۔ یوں جیسے موت ابھی بھی وہیں منڈلا رہی ہو، جیسے موت کا فرشتہ وہیں ہے، کسی اور کی تاک میں!

میں نے خوف زدہ نظروں سے اپنے بیٹے کو دیکھا، وہ بے خبر سو رہا تھا۔

سارا دن اس واقعے کا اثر رہا، بار بار تذکرہ ہوتا رہا۔

''ہائے بے چاری ماں!''

''کتنا رو رہی تھی!''

''کیسے تڑپ رہی تھی بچے کی جدائی میں!''

''بہت اذیت میں تھی بے چاری!''

''اس نے کب سوچا ہوگا کہ اس کی گود یوں اجڑ جائے گی!''

''پتا نہیں کب سنبھلے گی۔ سنبھلے گی بھی یا نہیں۔ ماں بھلا کب بھولتی ہے اپنی اولاد کو!''

''اللہ کسی ماں سے اس کی اولاد جدا نہ کرے!''

''اللہ اسے صبر دے!''

''اللہ کو یہی منظور تھا!''

میرے دل پر بھی اس واقعے کا اثر تھا۔ اس ماں کے غم کو میں اپنے دل میں بھی محسوس کر رہا تھا۔ ایک انجانا سا خوف میرے دل میں بھی سر اُٹھا رہا تھا۔

اور اس کے علاوہ بھی کچھ تھا جو مجھے کھائے جا رہا تھا۔ کچھ نامحسوس سا، کچھ کمی کا احساس۔ کہیں کچھ ''مسنگ'' تھا۔

اس پورے منظر میں کوئی تھا جو موجود تھا، مگر شاید کسی کو نظر نہیں آیا..... یا کسی نے اسے دیکھا ہی نہیں، کسی نے اس کا دکھ محسوس ہی نہیں کیا، سارا دن کسی نے اس کا تذکرہ ہی نہیں کیا۔

شاید آپ کو بھی خیال نہ آیا ہو۔

شاید آپ بھی نظر انداز کر گئے ہوں۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی پسِ منظر چلا جاتا ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں.....

وہ کون تھا؟

وہ وہی تھا جو اس منظر میں سب سے پہلے داخل ہوا تھا۔

آیئے تھوڑی دیر کے لیے واپس اسی صبح کے منظر میں چلتے ہیں، جہاں ہسپتال کے ایمرجنسی ہال میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ ڈاکٹرز، نرسیں، وارڈ بوائے، مریض، ان کے تیماردار، سب اپنی اپنی جگہ مصروفِ عمل تھے کہ اچانک ہلچل سی ہوتی ہے، سب چونک کر اُس طرف متوجہ ہوتے ہیں اور پھر.....

ایک شخص..... نہیں..... ایک شخص نہیں، ایک باپ اپنے بیٹے کے گھائل وجود کو سینے سے لگائے بھاگتا ہوا ڈاکٹر کی طرف آتا ہے۔ گھر سے لے کر ہسپتال تک آتے ہوئے شاید وہ محسوس کر چکا تھا کہ بچہ اس دنیا میں نہیں رہا، مگر ایک امید..... کہ شاید ایسا نہ ہو۔

اور ایک بے یقینی..... کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے!

یہ انسانی فطرت ہے کہ کسی بھی اپنے قریبی کے انتقال پر دِل چاہے ایک پل کے لیے ہی سہی، بے یقینی کا شکار ضرور ہوتا ہے کہ نہیں، نہیں، شاید ایسا نہ ہو، شاید وہ زندہ ہو جائے، شاید کوئی کرامت ہو جائے۔

اور پھر ڈاکٹر کے منہ سے بچے کی موت کا سن کر اُس باپ کے قدموں تلے سے بھی زمین نکلی

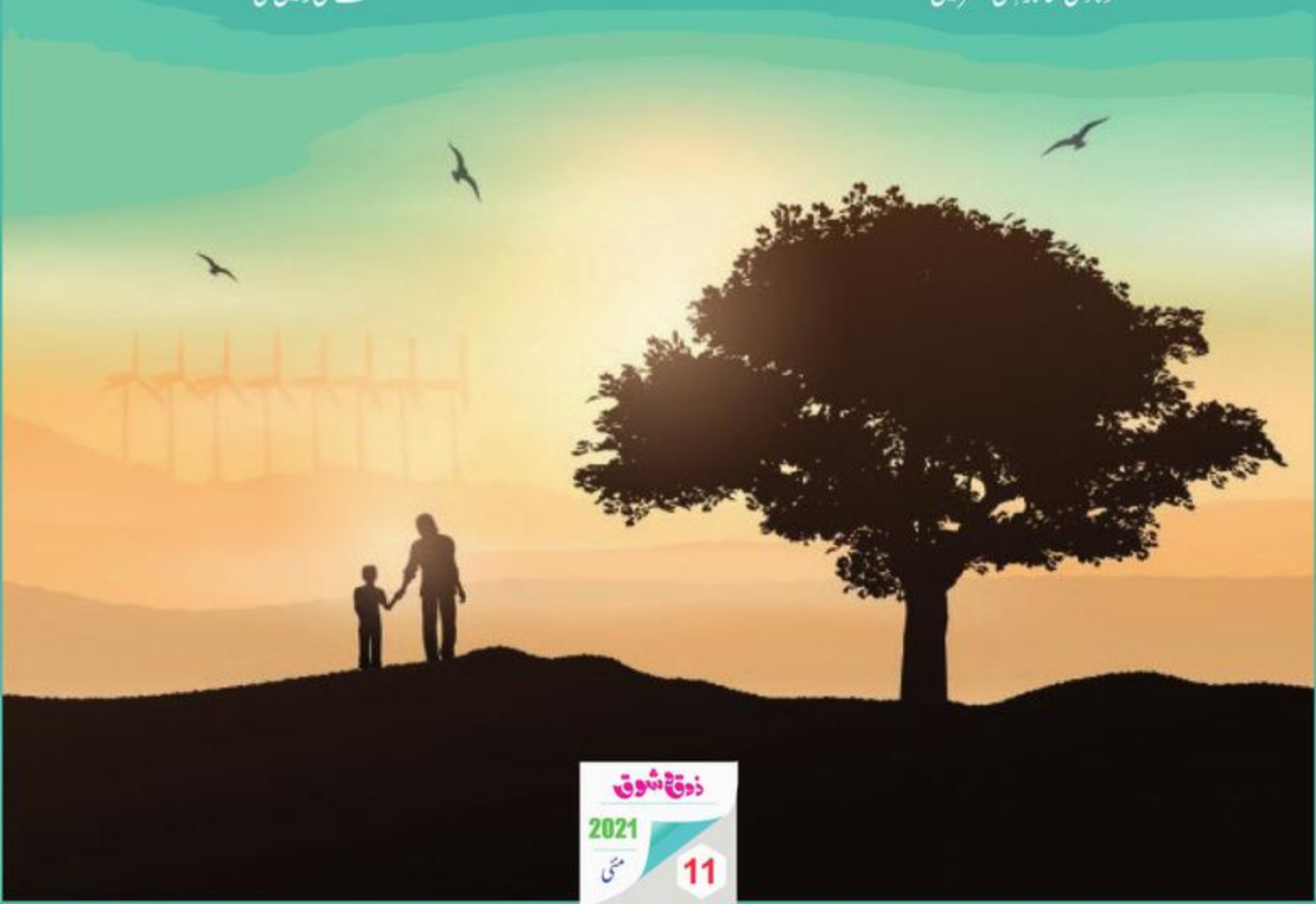

تھی، اس کی ٹانگوں سے بھی جان نکلی تھی۔ سہارے کے لیے اس نے پاس رکھی میز کو تھاما تھا۔ دل یک دم خالی ہو گیا تھا۔

یہ..... یہ کیا ہو گیا؟

آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسوؤں کے ریلے کو اُس نے خاموشی سے حلق میں اتارا تھا۔ وہ مرد تھا، اسے آنسو نہیں بہانے تھے، رونا نہیں تھا۔ مرد بھلا روتے ہوئے کب اچھے لگتے ہیں!

بنا آواز اور آنسوؤں کے جو روتا ہے وہ باپ ہوتا ہے۔

وہ بھی ہمت چھوڑ دے گا تو سب کو کون سنبھالے گا۔ بچے کو کون اٹھائے گا۔ جھک کر بچے کو دونوں بازوؤں میں بھرتے ہوئے اس نے سوچا۔ سانس لیتا زندگی سے بھرپور یہ وجود پھولوں سا نازک لگا کرتا تھا اور ابھی اسے اُٹھا کر چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ ایک ایک قدم من بھر کا لگ رہا تھا۔

ماں کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ دادا دادی غم سے نڈھال تھے۔ یہ بوجھ ایک باپ کو ہی اٹھانا تھا۔

ایمرجنسی ہال میں وقت کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ سب کچھ جیسے ''سلوموشن'' میں چل رہا تھا۔ بچے کو بازوؤں میں اٹھا کر مردہ قدموں سے چلتا باپ، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے غم زدہ دادا، بچے کی سسکتی ماں کو سنبھالتی دادی، اور سب کی نگاہوں کا مرکز بنی غم سے نڈھال ہوتی ماں!

سب کی نظریں ماں پر تھیں۔

سب اس کے لیے دکھی تھے۔

سب کی آنکھوں میں نمی سی تھی۔

سب ان کے جانے کے بعد ماں کا تذکرہ کر رہے تھے۔

سب اس ماں کے لیے صبر کی دعائیں کر رہے تھے۔

اس ہال میں شاید میں اکیلا تھا جو ماں کے ساتھ ساتھ اس باپ کے دکھ کو بھی سمجھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا۔

ایک ماں نے ہی نہیں، ایک باپ نے بھی اپنا بچہ کھویا تھا۔ اس بچے سے باپ کو بھی اتنا ہی پیار تھا جتنا ماں کو.....

بچے کی جدائی باپ کا کلیجا بھی چیر رہی تھی۔

وہ بھی ڈھے جانا چاہتا تھا، پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا۔

اس کا دل بھی چاہ رہا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے سہی، یہ ساری دنیا خالی ہو جائے اور وہ چیخ چیخ کر روئے یا وہ کسی ایسی جگہ جائے جہاں اسے روتے ہوئے کوئی نہ دیکھے، مگر اُس کی خاموش چیخیں اس کے وجود کے اندر ہی دم توڑ رہی تھیں۔

یا بس ماں، بچے کی یاد میں روئے گی!؟

کیا یہ باپ چند دن بعد بھول جائے گا اپنے بچے کو!؟

نہیں..... کبھی نہیں!

آج کے بعد وہ جب بھی کوئی کھلونا دیکھے گا.....

جب بھی کوئی کپڑا خریدے گا.....

جوتے خریدے گا.....

کوئی ٹافی..... کوئی بسکٹ..... کوئی چاکلیٹ خریدے گا.....

ہر چیز اُسے اپنے بچے کی یاد دلائے گی۔ اس بچے نے ہمیشہ اس کے دل میں یاد بن کر زندہ رہنا ہے، چاہے صدیاں گزر جائیں۔

دنیا کی کوئی چیز، کوئی رشتہ اس کمی کو پورا نہیں کر سکتا جو کمی ایک اولاد کے جانے سے ماں باپ کی زندگی میں آتی ہے۔

اس بچے کی پیدائش پر باپ کتنا خوش ہوا ہو گا اور اپنے بچے کے مستقبل کو لے کر نجانے کیا کیا منصوبے نہ سوچے ہوں گے، مگر.....

''ابو جی! گھر کب جانا ہے؟'' بیٹے کی آواز نے مجھے سوچوں کے سمندر سے باہر نکالا۔

''بہت جلد بیٹا! درد تو نہیں ہو رہا؟'' میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے پوچھا۔

''جی، تھوڑا تھوڑا ہو رہا ہے۔ امی کے پاس جانا ہے۔'' اس نے روہانسی آواز میں جواب دیا۔

''بس ابھی ڈاکٹر صاحب آئیں گے، ان سے اب چھٹی کی بات کریں گے۔ ٹھیک ہے؟'' میں نے اسے پیار سے بہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر صاحب کب آئیں گے؟'' اس نے پھر سوال کیا۔

''تھوڑی دیر میں آئیں گے۔''

''امی کے پاس جانا ہے۔''

تھوڑی دیر میں پھر وہ کہنے لگا تو میں نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

جب سے ہسپتال آئے تھے وہ کئی بار ماں کا پوچھ چکا تھا، بچوں کو ہر دُکھ، ہر درد، ہر بیماری میں بس ماں چاہیے ہوتی ہے۔

ہال میں زیادہ تر مریض بچوں کے ساتھ ان کی مائیں ہی تھیں۔

''آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ، میں ڈاکٹر صاحب سے بات کر کے آتا

ہوں۔'' میں وہاں سے ڈاکٹر کا بہانہ کر کے اٹھا اور ایمرجنسی ہال سے باہر آ گیا۔

یوں ہی طبیعت کچھ بوجھل سی ہو رہی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے راہداری، برآمدے سے ہوتا ہوا پارکنگ ایریا میں آ گیا۔ پارکنگ ایریا سے مین گیٹ تک کافی کھلا میدان تھا اور اِس پوری جگہ میں مختلف عمروں کے لوگ زیادہ تر مرد حضرات، جسے جہاں جگہ ملی وہاں کچھ بچھا کر بیٹھے ہوئے یا لیٹے ہوئے تھے۔

ہسپتال میں مریض کے ساتھ ایک فرد کو رُکنے کی اجازت تھی۔ بچوں کا ہسپتال

تھا تو اکثر مریض بچوں کے ساتھ مائیں رک جاتی تھیں۔

اور بچوں کے باپ بھی باہر تھے۔ وقتاً فوقتاً دوائیں، کھانا اور ضرورت کی دوسری چیزیں اندر بھجوانے کے لیے کسی ایک کا ہر وقت باہر موجود ہونا ضروری تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں اندر ہال کی طرف چل دیا۔

ہال میں وہی معمول کی چہل پہل تھی۔ خدا خدا کر کے ڈاکٹر کا بلاوا آیا، میں فوراً گیا۔ میرے بیٹے کا اپنڈکس کا آپریشن ہونا تھا۔ معمول کی کارروائی کے لیے ڈاکٹر صاحب نے ایک پرچہ میرے سامنے رکھا، جس پر مجھے دستخط کرنے تھے۔

پرچے پر چند جملے لکھے تھے کہ آپریشن کے دوران میں کسی بھی قسم کے نقصان کی ذمے داری ڈاکٹر یا ہسپتال پر نہیں ہوگی۔ پڑھتے پڑھتے آنکھیں دھندلا گئیں۔ ڈاکٹر کے لیے یہ معمول کی کارروائی تھی، مگر ایک باپ کے لیے!؟ جس کے دس سالہ بیٹے کا جسم کاٹ کر آپریشن کرنا تھا اور اِس دوران میں ذرا سی غفلت یا ذرا سی غلطی جان جانے کا ذریعہ بھی بن سکتی تھی۔ ڈوبتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے میں نے اس پرچے پر دستخط کر دیے۔

اور پھر تب سے لے کر آپریشن ہو جانے تک میرا پورا وجود جیسے دعا بن گیا۔ کسی پل قرار نہیں آیا، جب تک ڈاکٹر نے آپریشن تھیٹر سے باہر آ کر آپریشن مکمل ہو جانے کی خبر نہیں سنائی۔

اللہ کے فضل و کرم سے آپریشن بھی ٹھیک ہو گیا اور اگلے دن تک ڈاکٹر

نے چھٹی کا بھی کہہ دیا، مگر اُس بچے کی موت کے واقعے کی وجہ سے دل افسردہ تھا۔ اس باپ کی وجہ سے ایک نہ سمجھ میں آنے والا احساس مسلسل دل کو بے چین رکھے ہوئے تھا، اور یہ ایک باپ کی نہیں، بل کہ ہر باپ کی کہانی ہے۔

مرد اپنی زندگی تب تک جیتا ہے جب تک وہ باپ نہیں بن جاتا۔ باپ بن جانے کے بعد پھر وہ اپنے لیے نہیں، اپنی اولاد کے لیے جیتا ہے۔ اپنی اولاد کے مستقبل کے لیے وہ اپنے حال کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اپنی اولاد کی خواہشات پوری کرنے کے لیے اپنی ضرورتوں کو قربان کر دیتا ہے۔ اپنی اولاد کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی راحت اور آرام کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ اس کی ساری محنت، ساری دوڑ دھوپ اپنے بچوں کے لیے ہوتی ہے، مگر بچوں کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہے۔

معاشرے کا ہر فرد، چاہے وہ جس طبقے کا بھی ہو، تاجر، دکان دار، ملازم، ڈاکٹر، پھل فروش، چھوٹی چھوٹی معمولی چیزیں بیچنے کے لیے گلی گلی گھومنے والا، کچرا چننے والا، حتیٰ کہ گٹر نالیاں صاف کرنے والا، اس سے آپ پوچھیں کہ وہ یہ سارے کام، ساری محنت کیوں کر رہا ہے، سب کا جواب ایک ہی ہوگا کہ اپنے بچوں کی روزی روٹی کے لیے۔

بچہ گھر میں ماں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ماں کی ساری محنت اور قربانی اس کے سامنے ہوتی ہے۔ ماں اپنی محبت کا کھلا اظہار کرتی ہے اور باپ کی ساری محنت، ساری قربانی گھر سے باہر ہوتی ہے اور باپ کبھی بھی اپنی محبت کا کھلا اظہار نہیں کر پاتا، جیسے ماں کرتی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ باپ بچوں سے پیار نہیں کرتا یا باپ کا پیار ماں سے کم ہوتا ہے۔

ماں کی محبت سے انکار نہیں۔ ماں بلاشبہ اپنے بچوں سے بہت پیار کرتی ہے، اپنے بچوں کے لیے بہت تکلیفیں جھیلتی ہے، بہت قربانیاں دیتی ہے۔

مگر ماں کی محبت کو تسلیم کیا جاتا ہے، ماں کی محبت پر لکھا جاتا ہے۔ اس کی قربانیوں کو سراہا جاتا ہے، مگر باپ کی محبت اور باپ کی قربانیوں کے بارے میں کہنے والوں کی زبان گنگ اور لکھنے والوں کے قلم خاموش ہو جاتے ہیں۔

جب کہ ایک باپ بھی اپنی اولاد سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی ایک ماں کرتی ہے۔

اگر ماں کے قدموں تلے جنت ہے تو باپ کو بھی جنت کا دروازہ کہا گیا ہے۔

والد راضی ہوگا تو اللہ تعالیٰ بھی راضی ہوگا۔ خدمت کرنے میں ماں کا حق مقدم ہے تو اَدب و احترام میں والد کا حق زیادہ ہے۔

والد سے آگے چلنے کو منع کیا گیا ہے، والد سے پہلے بیٹھنے کو منع کیا گیا ہے، ان کے سامنے بھی آواز کو نیچی رکھنے کا حکم ہے۔

مجھے نہیں پتا کہ اس کہانی کا اختتام کیسے کرنا ہے۔ میں شروع میں ہی اعتراف کر چکا ہوں کہ میں ایسا لکھاری نہیں جو ایک باپ کے احساسات کو لفظوں کی زبان دے سکوں، مگر اُس شخص کے احساس کی قوت دیکھیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا قلم اٹھا، بل کہ اس کے احساس نے میرے قلم کو بھی ایک نیا رنگ، نیا موڑ دیا۔ مجھے یقین ہے کہ پڑھنے والوں کے دلوں پر بھی ایک نئی دستک ضرور ہوگی، کیوں کہ جو لفظ دل سے نکلتے ہیں وہ دل پر اثر ضرور کرتے ہیں۔

جیسے ماں کی محبت کو تسلیم کیا جاتا ہے، سراہا جاتا ہے، اس پر لکھا جاتا ہے اور ماں سے محبت کا کھلا اظہار کیا جاتا ہے، اسی طرح ہر باپ کے دل کے نہاں خانوں میں یہ خواہش، یہ حسرت دبی ہوتی ہے کہ اس کی محبت کو بھی تسلیم کیا جائے، سراہا جائے، اس پر بھی لکھا جائے اور باپ سے محبت کا کھلا اظہار کیا جائے، اس لیے بس آخری بات.....

آپ عمر کے جس حصے میں بھی ہوں، بچپن، لڑکپن، نوجوان، جوان، ادھیڑ عمر یا پھر آپ بوڑھے ہو چکے ہوں۔ آپ زندگی میں کوئی بھی مقام حاصل کر چکے ہوں، ڈاکٹر، انجینئر، ٹیچر، پروفیسر، سائنس دان، قاری، مفتی، عالم، صدر، وزیر اعظم ہی کیوں نہ بن چکے ہوں، اگر آپ کے والد حیات ہیں تو زندگی میں ایک بار اور اگر زندگی موقع دے تو بار بار، ہر طرح کے رعب، ڈر، اپنی عمر، اپنے مقام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کھلے لفظوں میں اپنے والد سے یہ ضرور کہیے گا کہ.....

''ابو جی! میں آپ سے بھی اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی اپنی ماں سے۔''

اور اگر آپ ایک باپ ہیں اور آپ کے بچے چاہے قد میں آپ کے برابر ہو چکے ہیں، زندگی میں ایک دفعہ ضرور ساری جھجک، سارے فاصلے بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے بچوں سے کھلے لفظوں میں یہ اظہار ضرور کیجیے گا:

''بیٹا! تمھارے ابو بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی تمھاری ماں!''

صرف ایک بار.....

خاندانی آمیزہ

جہانگیر عالم۔ کراچی

رات کے تیسرے پہر دستک کی آواز پر ہماری آنکھ کھلی۔ یہ دستک گھر یا کمرے کے دروازے پر نہیں تھی، بل کہ دل کے دائیں طرف جگر سے نیچے انتڑیوں کے آس پاس اٹھنے والے درد کے کچوکے تھے۔ میں نے بے قرار ہو کر کروٹ بدلی اور اُٹھ بیٹھا، لیکن اس کا وصال، فراق جان کا طالب تھا شاید، انگلیوں پر نچانے لگا۔ ہم نے ہر چند آواز دبانے کی کوشش کی کہ امی جان اٹھ جائیں گی اور وہی خاندانی نسخہ، ادرک اور خشخاش گھونٹ کر پلا دیں گی، لیکن درد کا اِصرار تھا کہ ہم اس کی دستک کی آواز بن جائیں۔

ہم پوری طرح یرغمال تھے، سو اُس کا فرمان بلا چوں چراں مان لیا۔ شدت درد سے بے اختیار ''ہائے'' نکل ہی گئی اور وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ امی جان فوراً اُٹھ بیٹھیں، گویا سوئی ہوئی ہی نہ ہوں۔ ہم اس وقت پیٹ پر ہاتھ رکھے دوہرے ہوئے بیٹھے تھے۔

وہ جلد ہی سمجھ گئیں کہ پکنک کی بد پرہیزی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ وہ فریج کی طرف لپکیں اور پھر گلاس میں بقول منے میاں ''زہر نما تریاق'' لے کر حاضر ہوئیں۔ اگرچہ ہم منہ میاں کو پلاتے وقت اس خاندانی آمیزے کے فضائل بیان کرتے نہ تھکتے تھے، لیکن اسے پیتے ہوئے ہماری بھی جان جاتی تھی۔

خیر، درد کی دشمنی میں زہر نما تریاق غٹا غٹ پی لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہڑبونگ مچانے والا درد گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا اور ہم پھر سے نیند کی وادیوں میں کھو جانے کے لیے بستر پر دراز ہو گئے۔ نیند تو نجانے کب آئی، لیکن آخری منظر یہ دیکھا کہ امی جان سرہانے بیٹھیں زیرِ لب کچھ پڑھ رہی تھیں۔

.....☆.....

''امی جان!'' منے میاں اسکول سے آتے ہی بستر پر ڈھے گئے اور وہیں سے امی کو آواز دی۔

''جی میری جان!'' وہ باورچی خانے سے دوڑتی ہوئی آئیں۔ منے نے پیٹ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

''ایک بات بتاؤں گا، مگر شرط یہ ہے کہ خاندانی آمیزہ نہیں پلائیں گی آپ۔'' منے میاں کے بھولپن پر وہ بے اختیار ہنس پڑیں۔

''پہلے آپ وہ پی لو، پھر جو بات بتانی ہو بتا دینا اور آج تمھاری پسند کا کھانا بنایا ہے۔'' انھوں نے اسے چکارا اور آمیزہ پلانے لگیں۔ اس نے آئیں بائیں شائیں تو بہت کی، مگر اُس کے درد کا مسیحا حلق کے پار جا چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بھرے گھر میں نیند کے سہارے خلوت کے مزے لوٹنے لگا۔ گویا دوائے درد نہ ہوئی، بھنگ ہوئی۔

.....☆.....

''امی جان!'' ہم تمام سپوت جن میں ہم اور منے میاں ہی شامل تھے، ایک پلے کارڈ اٹھائے (بزعم خویش) جلوس کی شکل میں باورچی خانے کے دروازے تک آئے۔

''جی میری جان!'' وہ ہماری طرف بڑھیں، پھر ٹھٹھک کر رُک گئیں۔

''یہ کیا اٹھا رکھا ہے؟'' انھوں نے حیرانی سے پوچھا، مگر جملہ پڑھ کر حیرانی کی جگہ مسکراہٹ چہرے پر بکھر گئی۔ پلے کارڈ پر لکھا تھا، ادرک کا دستور..... نامنظور، نامنظور۔''

''یوں نہیں لکھتے۔'' یہ کہہ کر اُنھوں نے پلے کارڈ لیا اور اُس میں کچھ ترمیم کر کے ہمیں تھما دیا، مگر یہ کیا؟ اس پر تو لکھا تھا ادرک کا منشور..... ان شاء اللہ! ہر بلا دُور۔'' پھر وہ مسکرا کر باورچی خانے کی طرف مڑ گئیں۔

''نہیں امی جان! آج آپ ہمیں اس طرح نہیں ٹال سکتیں۔'' ہم نے ہانک لگائی۔

''تو پھر کس طرح ٹال سکتی ہوں؟'' وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

''کیا ہو رہا ہے بچو!؟'' ابو جان اچانک گھر میں داخل ہوئے۔

''جی وہ ہم.....'' منے میاں نے کہنا چاہا لیکن پھر جھینپ کر خاموش ہو گئے۔ ہم نے پلے کارڈ آگے کر دیا تو وہ بھی ہنس پڑے۔ ہمیں تو پیروں میں لگی سر پر بجھی۔

''ابا جان! یہ کوئی لطیفہ نہیں، ہمیں زمانے کے ساتھ چلنا ہے، لہٰذا اَب اگر ہم بیمار ہوں تو ہمیں ہسپتال لے جایا جائے۔'' ہم برہم ہو گئے۔

''اچھا بابا! اللہ نہ کرے کہ تم میں سے کوئی بیمار ہو۔ تمھارے مطالبات تسلیم کیے جاتے ہیں۔'' ابو جان نے اعلان کیا تو ہماری خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ ہم سرخ رُو ہو کر اپنے کمروں کو سدھارے اور لگے بیماریوں کا انتظار کرنے کہ کب بخار آئے اور ہم ہسپتال کے کوہِ قاف کا چکر لگا کر آئیں۔ مستقبل قریب میں ہمیں ادرک کا زوال واضح نظر آنے لگا، کیوں کہ حلقۂ احباب میں ہم ہی تھے جنھیں ایسی چیز سے واسطہ پڑتا تھا جس کا سواد بندر تک نے نہیں چکھا، ہم تو ہیں ہی اشرف المخلوقات۔

ایک دن صبح صبح منے میاں نے دعویٰ کیا کہ انھیں بخار ہے۔ ہم ان کے کمرے میں فرحاں وشاداں پہنچے تو اُن کے کمزور پڑتے چہرے پر نظر پڑی، جہاں مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ پہلے تو امی جان نے ادرک کا آمیزہ لانا چاہا، مگر منے میاں نے مریل سی آواز میں وعدہ یاد دِلایا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مان گئیں اور ہمارا قافلہ سوئے ہسپتال روانہ ہوا۔ ابو جان کے چہرے پر تو پریشانی تھی، لیکن ہمارا اور منے میاں کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

ہسپتال پہنچنے پر ہمارے تمام خواب چکنا چور ہو گئے۔ کہاں گھر کی مسیحائیاں اور کہاں یہاں کی ترک تازیاں؟

ڈاکٹر صاحب مریض کا طویل چیک اَپ کرنے لگتے تو ہم بغور دیکھنا شروع کر دیتے۔ وہ فحص دقیق کے بعد ایک چٹھی پر مریض کے معاش سے کئی گنا بڑھ کر دوائیں لکھ رہے تھے، جیسے ہمارے ملک کی معیشت ٹھیک کرنے ٹھیکا ڈاکٹر صاحبان نے لیا ہوا ہے۔ ایک ایک مریض کو اِتنی دوائیں دے رہے تھے کہ نسلیں کھاتی رہیں۔ مریض صاحب پروانۂ شفا حاصل کرنے کے بعد لٹکا ہوا منہ اٹھائے (جس میں مرض پر اِلزام کم، چٹھی پر زیادہ آتا ہے) اس طرح جا رہے تھے کہ ع

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے

اب پروانۂ شفا حاصل کرنے کی باری منے میاں کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب ہمہ تن دیو بن کر اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''منہ کھولو بیٹا!'' منے میاں نے پٹ سے منہ کھول دیا۔

منہ کھولنے کا کہا تھا، غار نہیں۔'' انھوں نے منے کے بڑے سے منہ پر چوٹ کی تو منے میاں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کچھ دیر غار نما منہ میں ٹارچ کی روشنی سے بخار تلاش کرتے رہے، پھر بغل میں تھرمامیٹر لگانے کی رسم پوری کی۔ اس کے بعد اصل مقصد، یعنی چٹھی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس پر چند آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر ہمیں تھما دیں۔ اس چٹھی پر انگریزی زبان قسم کھانے کو تیار ہے کہ ''یہ میں نہیں ہوں''، لیکن ڈاکٹر صاحب ان لکیروں کو انگریزی ہی کا الزام دے رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اِنجکشن والا جن بھی آ پہنچا اور منے میاں کو دبوچ لیا۔ پہلے تو منے میاں کے چہرے کا رنگ ہی اڑ گیا، لیکن وہ لاکھ سمجھانے کے باوجود تن بتقدیر آئے تھے، لہٰذا اَب پچھتائے کیا ہوت! ہم اس منظر کی تاب نہ لا سکتے تھے، اس لیے آنکھیں موند لیں، پھر تجسس سے مجبور ہو کر عین اس وقت آنکھیں کھول دیں جس وقت وہ پھڑ پھڑا کر سدھ ہو چکے تھے اور آہنی ہاتھ سوئی ان کے بازو میں اتار رہے تھے۔ منے میاں کی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں، لیکن ادبی رنگ ان چیخوں مین بھی گھول کر ملا ہوا تھا: ''خنجر نما سوئی مت چبھوئیں، خنجر نما سوئی مت چبھوئیں۔''، مگر نوشتۂ تقدیر پورا ہو کر ہی رہتا ہے، سو ہو کر رہا۔ منے میاں بازو سہلاتے اور آنسو پونچھتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھے۔ ساتھ میں دواؤں سے بھری تھیلی کا نسخۂ کیمیا بھی رکھ لیا۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا: ''بخار تو اِنجکشن سے ہی رفو چکر ہو جائے گا، لیکن اس کے بعد ہونے والی کمزوری ''دفع'' کرنے کے لیے تھوڑی بہت ''دواؤں'' کا کورس ضروری ہے۔ یہ مکمل ہو جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر ملاقات کے لیے آ جانا۔'' وہ شرارتاً مسکرائے۔

''روزِ جزا سے پہلے یا روز جزا کے بعد؟'' منے میاں پہلے ہی بھرے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ڈاکٹر صاحب پکڑ میں آئے فوراً بھڑاس نکال لی۔

''السلام علیکم! امی جان!'' ہم نے اچھے بچوں کی طرح گھر میں داخل ہوتے ہی سلام کیا۔

''وعلیکم السلام میری جان! کیا رہا ہسپتال میں؟'' انھوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو منے میاں تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بستر میں جا گھسے۔ ہم نے بھی کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔

دو دِن تک خود داری سے مجبور ہو کر منے میاں دوائیاں نگلتے رہے، لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائی گی۔ آخر ایک دن منہ بسور کر امی جان کے پاس آئے اور خالص ادبی لہجے میں کہنے لگے:

''امی! وہ زہر نما تریاق، بے درد مسیحا کے خنجر نما ٹیکے سے بدرجہا بہتر ہے۔''

منے میاں نے بازو سہلاتے ہوئے کہا تو سب کھل کھلا کر ہنس پڑے اور منے میاں زہر نما تریاق کا پیالہ حلق میں انڈیلنے لگے۔

سوال آدھا جواب آدھا ۲۰

الطاف حسین۔ کراچی

اس کھیل میں چند جملے ہیں، ہر جملہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں کچھ معلومات دی گئی ہیں، جب کہ دوسرے حصے میں اسی طرح کی معلومات آپ سے پوچھی گئی ہیں۔ آپ مطلوبہ معلومات ہمیں ۳۱ مئی تک ارسال کر دیجیے، ہم آپ کو اِس کا انعام روانہ کر دیں گے۔ ایک سے زیادہ درست جوابات موصول ہونے کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعے تین قارئین کرام کو انعام سے نوازا جائے گا۔ کوپن پُر کر کے ساتھ بھیجنا نہ بھولیے گا۔

۱ قرآن مجید کی ''سورۂ اخلاص'' میں لفظ ''اللہ'' دو مرتبہ آیا ہے۔ آپ اس سورت کا نام بتائیے..... جس کی ہر آیت میں لفظ ''اللہ'' آتا ہے۔

۲ ''اِمامُ القبلتین'' (دو قبلوں کے امام) حضور نبی کریم ﷺ کا لقب ہے..... بتائیے ''امام الانبیاء'' (نبیوں کے امام) کون سے نبی علیہ السلام کا لقب ہے؟

۳ حضرت ہود علیہ السلام کی عمر مُبارک 365 سال تھی..... آپ یہ بتائیے کہ حضرت صالح علیہ السلام کتنے سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئے تھے؟

۴ ''اُمُّ المومنین'' (مومنوں کی ماں) حضور نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کا خطاب ہے..... آپ یہ بتائیے کہ ''اُمُّ العرب'' (عربوں کی ماں) کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

۵ 1757ء میں (جنگ پلاسی میں) بنگال کے نواب سراج الدولہ شہید نے میر جعفر کی غداری کی وجہ سے انگریزوں سے شکست کھائی تھی..... بتائیے 1799ء میں (چوتھی) جنگ میسور میں سلطان فتح علی ٹیپو شہید نے کس کی غداری کی وجہ سے انگریزوں سے شکست کھائی تھی؟

۶ ''مَیپل کی سَرزمین'' کینیڈا کو کہا جاتا ہے..... بتائیے ''ملکہ شیبا کی سَرزمین'' کس ملک کو کہتے ہیں؟

۷ ''مارسیلز'' کو فرانس کی مشہور بندرگاہ کا درجہ حاصل ہے..... بتائیے ''نیپلز'' کس ملک کی مشہور بندرگاہ ہے؟

۸ سعودی عرب کی کرنسی کو ''ریال'' کہتے ہیں..... آپ یہ بتائیے کہ ''لیک'' کس ملک کی کرنسی کا نام ہے؟

۹ ''کیلشیم'' کی کمی سے دانت اور ہڈیاں کمزور ہو جاتی ہیں، عضلاتی درد اور دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو جاتی ہے..... بتائیے ''فاسفورس'' کی کمی سے کیا اثرات پیدا ہوتے ہیں؟

۱۰ ''اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت'' اردو زبان کی ایک مشہور ضرب المثل ہے، جس کا مطلب ہے: ''موقع ہاتھ سے نکل جائے تو پچھتانے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا''..... بتائیے ''آ بیل مجھے مار'' کا کیا مطلب ہے؟

جذبہ جواں، منزل آساں

حافظ محمد اشرف۔ حاصل پور

میں ایک بہت بڑا ادیب بننا چاہتا ہوں۔ میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

''آپ کا مشغلہ کیا ہے؟''

میں نے اس سے پوچھا۔

''میں ایک ہوٹل میں ملازم ہوں۔''

اس نے جواب دیا۔

''آپ کو اَدیب بننے کا شوق کس طرح ہوا، جب کہ آپ ایک ہوٹل میں ملازم ہیں اور ہوٹل تو بس برتن مانجھنا اور لوگوں کو کھانا کھلانا، اس حد تک رہتا ہے۔ بھلا اس کا اس مشغلے سے کیا تعلق!؟''

میں نے تعجب کے انداز میں مزید اُس سے پوچھا اور دِل ہی دل میں سوچنے لگا کہ ادیب بننے کے لیے تو بہت زیادہ، بل کہ بہت ہی زیادہ مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ادیب بننا مطالعے کے بغیر آسان نہیں ہے۔ اسے تو ہوٹل سے خود اپنا مطالعہ کرنے کی فرصت بمشکل ملتی ہوگی، دوسرا مطالعہ تو اپنی جگہ ٹھہرا۔

''جناب! میں ایک رسالے کا مستقل قاری ہوں اور اُس رسالے کے مدیر کو ایک کہانی کی تلاش ہے۔ ایک ایسی کہانی جو آج تک کسی نے بھی نہ لکھی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کہانی میں لکھ کر اِرسال کروں۔ مجھے ادیب بننے کا شوق کافی عرصے سے ہے، اس سلسلے میں، میں کچھ کہانیاں لکھ کر بھیج بھی چکا ہوں، مگر شاید کسی وجہ وہ نا قابلِ اشاعت ہو جاتی ہیں۔

میں ایک اچھا ادیب بن سکوں، اس کے لیے میں نے کسی ادیب کی تلاش شروع کی، پھر مجھے آپ کے بارے میں پتا چلا اور میں آپ کے پاس چلا آیا۔''

اس نے ادیب بننے کی تڑپ بڑے انوکھے انداز میں بیان کی۔

''مگر میں اس بارے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

میں نے ہمدردی جتاتے ہوئے پوچھا۔

''آپ مجھے کہانی لکھنے کے کچھ ایسے اصول وضوابط جو کہ کہانی لکھنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں، وہ تو بتا سکتے ہیں۔''

اس کا انداز خاصا التجائیہ تھا۔ میرے دل میں اس کے لیے مزید ہمدردی بڑھ گئی، مگر جن اصول وضوابط کے بارے میں وہ پوچھ رہا تھا وہ تو خود میں بھی زیادہ نہیں جانتا تھا، کیوں کہ میں تو خود کثرتِ مطالعہ کی مدد سے ایک بڑا اَدیب بنا تھا، اسے میں کیا بتاتا، مگر پھر بھی اس کا دل رکھنے کے لیے چند اُصول جو کہ میرے علم میں تھے، اسے بتا دیے۔

مثلاً کہانی صفحے کے ایک طرف لکھی جائے، ایک سطر چھوڑ کر لکھی جائے۔ کہانی کا آغاز اچھا ہو، آسان الفاظ میں ڈھلی ہوئی ہو اور ساتھ ساتھ کہانی دل چسپ اور نصیحت آموز ہو۔

وہ بہت غور سے میرے ان اصولوں کو سُن رہا تھا اور ساتھ ہی ایک کاغذ پر نوٹ بھی کرتا جا رہا تھا، پھر میں

نے اس سے پوچھا:

''آپ کس رسالے کے قاری ہیں؟ اس کا نام کیا ہے؟ اور آپ کس وقت اس کا مطالعہ کرتے ہیں، جب کہ ہوٹل کے ملازمین کے لیے تو مطالعہ کافی دشوار ہوتا ہے۔''

اس نے مجھے کافی حیرت ناک جواب دیا، کہنے لگا:

''جناب عالی! ہر کام کے لیے کچھ وقت نکالنا پڑتا ہے، جب تک آپ وقت کو کچھ نہ دو گے، وقت بھی آپ کو کچھ نہیں دے گا۔

ہوٹل میں میری ملازمت بارہ گھنٹے کی ہے۔ دن رات کی نہیں، بقیہ بارہ گھنٹوں میں سے میں نے ایک گھنٹا روزانہ مطالعے کے لیے مقرر کیا ہوا ہے۔ یوں میں مسلسل مطالعہ بھی کرتا رہتا ہوں۔

رہی بات رسالے کی تو اُس کا نام 'طلوعِ سحر' ہے۔ شاید آپ کی بھی نظر سے گزرا ہوگا۔ آخر آپ بھی اتنے بڑے ادیب ہیں، آپ کا تو مشغلہ ہی یہی ہے۔''

پھر میں نے اس کا نام پوچھا تو اُس نے اپنا نام ادیب قمر بتایا اور شکریے کے دو بول بول کر سلام کر کے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا، پھر میں بھی ہر ماہ اس رسالے، طلوعِ سحر کا باقاعدگی سے مطالعہ کرنے لگا، کیوں کہ اب مجھے بھی اس رسالے کے مدیر کی طرح ایک کہانی کی تلاش تھی۔ ایک ایسی کہانی جو ادیب قمر لکھاری کے نام سے اس رسالے کا حصہ ہو اور میرا دل کہتا تھا کہ ضرور وہ اپنی کاوش میں کام یاب ہوگا اور کسی نہ کسی دن ضرور اُس کی کوئی کہانی اس رسالے کی زینت بنے گی۔

ٹھیک چھے ماہ بعد اُس رسالے میں اس کی کہانی شائع ہوگئی۔ میں نے بڑی توجہ سے اس کہانی کو پڑھا۔ جن اصول وضوابط کو وہ مجھ سے سن کر گیا تھا، بالکل اسی ڈھپ پر وہ کہانی لکھی گئی تھی اور صرف یہی نہیں، بل کہ مدیر صاحب نے اس کہانی کو سرورق کہانی بنا دیا تھا اور واقعی وہ کہانی سرورق کہانی بننے کے لائق تھی۔ میں نے اسی وقت یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جو شخص کوشش اور محنت کرتا ہے وہ اپنی محنت کا پھل ضرور پالیتا ہے۔ آج اس نے مسلسل اپنی جد و جہد سے کام یابی حاصل کر لی تھی۔

جب انسان کا جذبہ جواں ہو تو منزل آساں ہو جاتی ہے، چاہے اس کا راستہ کتنا ہی کٹھن کیوں نہ ہو۔

علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ

ماہ نامہ

ذوق و شوق

کراچی

الحمدللہ! اب تک ماہ نامہ ''ذوق و شوق'' کے مطالعے سے لگ بھگ پچاس ہزار لوگ کتاب دوست بنے چکے ہیں۔

کتاب دوست بنیے اور بنائیے

اپنے عزیز و اقارب اور رشتے داروں کے بچوں کو کتاب دوست بنانے اور صدقہ جاریہ میں حصہ لینے کے لیے ماہ نامہ ''ذوق و شوق'' کے سالانہ خریدار خود بھی بنیے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیجیے۔

سالانہ خریداری کے 1000 روپے آپ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر میں جمع کروا سکتے ہیں۔ اپنا نام، رابطہ نمبر اور جس ماہ سے جاری کروانا ہے ہمیں واٹس اپ کیجیے اور ہر ماہ گھر بیٹھے ماہ نامہ ''ذوق و شوق'' کا مطالعہ کیجیے۔

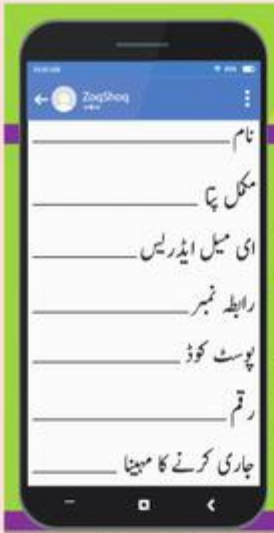

خط و کتابت کا پتا

ماہ نامہ ذوق و شوق، پی۔ او۔ بکس: 17984، گلشن اقبال، کراچی۔ پوسٹ کوڈ: 75300

رابطہ نمبر: 021-34990760 ای میل: zouqshouq@hotmail.com

zouq o shouq 0324-2028753

اکاؤنٹ نمبر

Bank: Meezan Bank Title: Bait ul ilm trust zouq o shouq
Account Number: 0179-0103431456
Address: Soldier bazar branch, Karachi.

سود

اعلانِ جنگ

محمد ذیشان فرخ۔ کراچی

عامر چھٹی جماعت کا طالب علم ہے۔ اس کے والد فرقان صاحب کا کپڑے کا کاروبار ہے۔ عامر ایک سمجھ دار اور ذہین طالب علم ہے۔ اس کی ایک اچھی عادت یہ ہے کہ وہ ہر بات میں غور و فکر کر کے اس کی اچھائی یا بُرائی کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔

ایک مرتبہ اسلامیات کے دورانیے میں اس کے استاد، خلیل صاحب سود کی حرمت اور بُرائی بیان کر رہے تھے۔ خلیل صاحب نے بتایا کہ اسلام میں قرض دے کر اُس پر کسی قسم کا فائدہ حاصل کرنا کبیرہ گناہ ہے، یعنی آپ کسی کو سو روپے بطورِ قرض دے کر اُس سے سو روپے سے زیادہ کا مطالبہ کریں تو یہ حرام ہے۔ اس کے بعد خلیل صاحب نے بتایا کہ سودی معاملات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے جنگ قرار دیا ہے اور ہمارے رسول ﷺ نے سود لینے اور دینے والے اور اِن معاملات میں کسی بھی قسم کی شمولیت کرنے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ عامر یہ ساری باتیں بغور سنتا رہا۔

دو دِن بعد رات کو کھانے کی میز پر فرقان صاحب نے اس کی امی کو بتایا کہ انھوں نے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے قرض کے لیے سودی بینک میں درخواست دی ہے اور اُمید ہے کہ قرض کی درخواست منظور ہو جائے گی۔ قرض کا نام سنتے ہی عامر چونکا۔ اسے خلیل صاحب کی باتیں یاد آ گئیں۔ اپنے والد سے اس بارے میں کچھ پوچھنے کی ہمت تو نہیں ہوئی، لیکن اس کی طبیعت بے چین ہو گئی۔

رات بھر اُس کے دماغ میں کئی سوال گردش کرتے رہے۔ کیا ابو بینک سے قرض لے کر سود کے ساتھ واپس کریں گے؟ نہیں، میرے ابو یہ کام نہیں کر سکتے۔ انھیں معلوم ہو گا کہ سود لینا اور دینا اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے جنگ ہے، لیکن سودی بینک کیا بلا سود قرض دے دے گا؟ عامر جیسے جیسے سوچتا جا رہا تھا، اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے کر وقتی طور پر اُس کی پریشانی کو چھین لیا۔

صبح وہ حسبِ معمول اسکول گیا۔ اسلامیات کے دورانیے میں خلیل صاحب آئے اور سبق پڑھایا۔ دورانیہ ختم ہوا تو عامر، خلیل صاحب کے پاس گیا۔

''سر! میں ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟'' عامر نے پریشانی کے عالم میں سوال کیا۔ خلیل صاحب نے شفقت سے کہا:

''پوچھو بیٹا! کیا بات ہے؟ کچھ پریشان لگ رہے ہو؟''

''سر! کیا سودی بینک قرض، مدد کے طور پر بھی دے دیتے ہیں یا اس

پر ضرور سود لیتے ہیں؟'' عامر کے اس استفسار پر خلیل صاحب نے حیرت سے عامر کو دیکھا اور پوچھا:

''پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے یہ سوال کیوں پوچھا؟ بیٹا! مجھے پوری بات بتاؤ۔''

''سر! میرے ابو نے کل رات میری امی سے کہا تھا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں سودی بینک سے قرض لے رہے ہیں۔ سر! آپ نے قرض پر سُود کے بارے میں ہمیں بتایا تھا۔ میں اس سلسلے میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا میرے ابو کو بینک سود پر ہی قرضہ دے گا؟''

عامر نے پوری بات بتائی۔ خلیل صاحب یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ اس ذہین لڑکے نے ان کی بات پوری توجہ سے سنی ہے اور اَب اسے اپنے والد کی فکر ہے کہ کہیں وہ اس سنگین گناہ میں مبتلا ہونے تو نہیں جا رہے۔ خلیل صاحب نے عامر کو بتایا:

''بیٹا! حقیقت میں بینک مدد نہیں کرتا، بل کہ سود پر ہی قرضہ دیتا ہے۔ یہ افسوس ناک امر ہے کہ ہم مغربی معاشی نظام کو اپنائے بیٹھے ہیں اور سودی بینکوں کو ترجیح دیتے ہیں۔'' یہ سنتے ہی عامر کے جیسے ہوش ہی اڑ گئے۔

کیا ابو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے جنگ کی طرف جا رہے ہیں؟ عامر کا دِل بیٹھا جا رہا تھا۔ خلیل صاحب نے عامر کی پیشانی دیکھ کر اُسے دلاسا دِیا:

''بیٹا! آپ اپنے ابو کو سمجھانے کی کوشش کرو اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرو کہ وہ آپ کے ابو کو اِس گناہ سے بچائے۔ ان شاءاللہ! اللہ تعالیٰ تمھاری پُرخلوص دعا ضرور قبول فرمائیں گے۔'' یہ کہہ کر خلیل صاحب چلے گئے۔

عامر تھکے تھکے قدموں سے گھر میں داخل ہوا۔ ابو کو آخر میں کیسے سمجھاؤں؟ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ فرقان صاحب غصے کے تیز تھے اور عامر اپنے ابو سے ڈرتا بھی تھا۔ عامر کو خلیل صاحب کی بات یاد آئی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کا کہا تھا۔ عامر نے وضو کیا اور دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی:

''یااللہ! آپ میرے دل کی بات جانتے ہیں۔ یااللہ! میں آپ سے اپنے ابو کی دنیا اور آخرت کی بہتری مانگتا ہوں۔ یااللہ! آپ ابو کو اپنی نافرمانی سے بچا لیجیے۔ یااللہ! مجھے ہمت دیں اور میری مدد کریں۔ میری مدد کریں۔ میری مدد کریں۔''

اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ جب بندہ اس طرح گریہ و زاری کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ لازمی مدد فرماتے ہیں۔

عامر کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اسے سوچوں میں گم دیکھ کر اُس کی امی نے پوچھا:

''عامر! کیا بات ہے؟ چپ چپ کیوں ہو؟ کیا اسکول میں کچھ ہوا ہے؟''

نہیں امی! میں ٹھیک ہوں، کچھ نہیں ہوا۔'' عامر نے مصنوعی مسکراہٹ دکھائی۔

اس دوران میں کسی کا فون آ گیا اور اُس کی امی کی توجہ فون کی طرف ہو گئی۔

رات کو کھانے پر عامر مسلسل اپنے والد کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنے ابو کو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی بغاوت اور جنگ سے روکنا چاہتا تھا۔ اس نے ہمت کر کے اپنے ابو سے بات کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس کا دِل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے ابو کو چیخ چیخ کر بولے کہ وہ سودی بینک سے قرضہ نہ لیں، اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے جنگ نہ کریں، لیکن اس کی آواز گنگ ہو گئی۔

اگلے دن اسکول میں وہ پھر خلیل صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔ اسلامیات کے دورانیے کے بعد خلیل صاحب نے اسے اشارہ کیا۔ وہ فوراً اُن کے پاس گیا۔ خلیل صاحب نے پوچھا:

''کیا ہوا؟ تم نے اپنے والد سے بات کی؟'' عامر نے رنجیدہ لہجے میں کہا:

''میں ابو سے بات نہیں کر سکا۔ میری ہمت نہیں ہوئی۔ میں کیا کروں؟ میں کیسے انھیں روکوں؟ وہ میری بات سن کر مجھے ڈانٹیں گے کہ تمھیں ان باتوں کا کیا پتا اور تم کیا مجھے سمجھانے چلے ہو۔ سر! میں نے اللہ تعالیٰ سے بھی دعا کی، لیکن میری ہمت نہیں ہوئی۔'' خلیل صاحب نے مسکرا کر عامر کو اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا:

''عامر! مجھے آج دو خوشیاں ملی ہیں۔ ایک تو یہ کہ تم نے اپنے والد کو اللہ تعالیٰ کی ناراضی سے بچانے کی فکر کی اور دوسری خوشی یہ کہ میں اس کی وجہ بنا۔ عامر! کیا تمھارے گھر میں آسان ترجمہ قرآن ہے؟'' عامر نے اثبات میں جواب دیا:

''جی سر! بالکل ہے۔'' اب خلیل صاحب نے عامر کو پورا منصوبہ بتایا:

''تم گھر جاؤ اور سورۂ بقرہ کی آیات ۲۷۸ اور ۲۷۹ اور اُن کا ترجمہ پڑھو، پھر رات کو کھانے کے بعد اپنے والد کو یہ آیات پڑھاؤ اور اُن سے ان آیات کا مطلب پوچھو۔ ان شاءاللہ! تمھارے والد سمجھ جائیں گے اور تمھارا فرض پورا ہو جائے گا۔ مجھے کل اپنی کام یابی کی خبر ضرور دینا۔'' خلیل صاحب یہ کہہ کر اِسٹاف روم کی طرف چلے گئے۔

گھر آ کر عامر نے پھر اللہ تعالیٰ سے دو رکعت نماز پڑھ کر دعا کی۔ اس معصوم بچے کا دِل اپنے والد کو صراط مستقیم پر لانے کے لیے بے چین تھا۔ وہ اپنے والد کو اِس گناہ سے بچانا چاہ رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اپنے نیک

مقصد میں ضرور کام یاب ہوگا۔ نماز کے بعد اُس نے قرآن مجید کھول کر سورۂ بقرہ کی آیات ۲۷۸ اور ۲۷۹ اور اُن کا ترجمہ پڑھا۔

رات کو کھانے کے دوران میں فرقان صاحب نے عامر کی امی کو بتایا کہ ان کی قرض کی درخواست منظور ہوگئی ہے اور تین یا چار دِن میں مطلوبہ رقم مل جائے گی۔ عامر یہ سن کر بے حد پریشان ہوا، لیکن اسے یقین تھا کہ وہ اپنے والد کو اِس گناہ سے بچالے گا۔

کھانے کے بعد اُس نے اپنے والد سے کہا:

''ابو! میں سورۂ بقرہ کی آیات کا ترجمہ پڑھ رہا تھا۔ آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔''

اس کے والد خوش ہوئے کہ میرا بیٹا قرآن پاک پڑھ رہا ہے۔ انھوں نے کہا:

''پوچھو بیٹا! کیا بات ہے؟''

عامر آسان ترجمہ قرآن لے کر فرقان صاحب کے پاس آیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ سورۂ بقرہ کی آیات ۲۷۸ اور ۲۷۹ اپنے والد کے سامنے کردیں۔

''ابو! ان آیات میں یہ لکھا ہے کہ سود اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے اعلانِ جنگ ہے۔ ابو! یہ سود کیا ہوتا ہے اور سود اِعلان جنگ کیسے ہے؟''

عامر نے معصومیت سے اپنے والد سے سوال کیا۔ فرقان صاحب نے آیات کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا:

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اگر تم واقعی مومن ہو تو سود کا جو حصہ باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، پھر بھی اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو اور اگر تم سود سے توبہ کرو تو تمھارا اصلی سرمایہ تمھارا حق ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

ترجمہ پڑھ کر فرقان صاحب ایک دم خاموش ہوگئے اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ انھیں احساس ہوگیا کہ وہ کس تباہی اور بربادی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ اپنے بیٹے سے کسی قسم کی بات کرنے کی حالت میں نہیں تھے۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ عامر نے محسوس کیا کہ اس کے والد کو اپنے گناہ کا احساس ہوگیا ہے۔ اس کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ اب اسے نتیجے کا انتظار تھا۔

دوسرے دن اس نے خلیل صاحب کو ساری بات بتائی جس پر اُنھوں نے عامر کو مبارک باد دی:

''بیٹا! تمھارا کام ہوگیا۔ اب تمھارے ابو اِس گناہ کے قریب بھی نہیں جائیں گے۔ تم اب مطمئن رہو۔''

عامر اَب واقعی مطمئن تھا۔

رات کے کھانے پر فرقان صاحب عامر کی امی کو بتا رہے تھے کہ انھوں نے سے قرض کی درخواست واپس لے لی ہے، پھر اُنھوں نے عامر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''تمھارے بیٹے نے مجھے بروقت اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے جنگ سے بچالیا ہے۔''

اس کی امی نے حیرت سے دونوں باپ بیٹے کی طرف دیکھا اور جب انھیں پوری بات معلوم ہوئی تو اُن کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو بہہ نکلے۔ واقعی عامر نے اللہ تعالیٰ کی مدد سے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اب اس کی پریشانی ختم ہوچکی تھی اور اِطمینان اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

بدلتے موسم

محمد شریف شیوہؔ۔ لاہور

آتی ہے پہلے سردی
پت جھڑ بھی آئے جلدی

پیچھے بہار آئے
پھولوں پہ نور چھائے

پھر اس کے بعد گرمی
کرتی نہیں جو نرمی

سورج دکھائے آنکھیں
دن لمبے چھوٹی راتیں

تپتے ہیں سارے رستے
بادل نہیں برستے

بے چین ہیں مویشی
لُو میں تپش ہے ایسی

پنچھی بھی ہیں پیاسے
شعلے عیاں ہوا سے

سب مانگیں پھر دعائیں
چھائیں سیہ گھٹائیں

جاری ہو بوندا باندی
جائے گھٹن یہ ساری

گرمی کا زور ٹوٹے
زحمت سے جان چھوٹے

سبزے کا پھر چلن ہو
گل بار ہر چمن ہو

رمضان کا پھر مہینا
جو ختم ہو کبھی ، نہ

پھر عید آئے ایسی
دل مانگتا ہے جیسی

خوشیاں منائیں سارے
شیوہؔ یہ چاند تارے

جھوٹوں کے جھوٹے ۴

۴۔ طلیحہ اسدی

بنوعبس، بنوذبیان اور دیگر قبیلے جو مدینہ منورہ کے اردگرد آباد تھے اور اُعراب مدینہ کہلاتے تھے، انھیں چاہیے تو یہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اطاعت قبول کر لیتے، زکوٰۃ کی فرضیت کے بھی قائل ہو جاتے اور دوبارہ اسلام قبول کر کے پکے سچے مسلمان بن جاتے، لیکن انھوں نے نبوت کے جھوٹے دعوے دار طلیحہ اسدی کے ساتھ شامل ہونا قبول کیا۔ اس سے جھوٹے نبی طلیحہ اسدی کو مزید قوت ملی۔

اب جب کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر تازہ دم ہو چکا تھا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسلامی لشکر کو گیارہ حصوں میں تقسیم فرمایا۔

ایک حصے کے سردار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے۔ انھیں طلیحہ اسدی اور مالک بن نویرہ کی طرف روانہ فرمایا۔ طلیحہ تو نبوت کا جھوٹا دعوے دار تھا، جب کہ مالک بن نویرہ زکوٰۃ کا منکر تھا اور اُن دونوں نے ایک دوسرے سے معاہدہ کر رکھا تھا۔

طلیحہ، بزاخہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم دیا:

"تم پہلے قبیلہ "بنو طے" کی طرف جاؤ، پھر بزاخہ کا رُخ کرنا۔ وہاں سے فارغ ہو جاؤ تو پھر بطاح کا رُخ کرنا اور جب تم اس مہم سے فارغ ہو جاؤ تو میرا دوسرا حکم آنے تک وہیں ٹھہرنا۔"

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بنو طے کی طرف رخ کیا۔ اس سے پہلے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کو قبیلہ بنو طے کی روانہ فرمایا، تاکہ وہ اپنے قبیلے کے لوگوں کو سمجھائیں۔ انھوں نے اپنے قبیلے میں جا کر کہا:

"دیکھو! خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) ایک لشکر جرار لے کر تمھاری طرف آ رہے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم لوگ اسلام قبول کر لو، طلیحہ کا ساتھ چھوڑ دو، ورنہ اسلامی فوج تمھیں تباہ و برباد کر دے گی۔"

یہ سن کر وہ لوگ عدی رضی اللہ عنہ کا مزاق اڑانے لگے۔ اس سے پہلے یہ لوگ ان کی بات فوراً مان لیا کرتے تھے۔ اس بات پر حضرت عدی رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے غصے میں انھیں ڈانٹتے ہوئے فرمایا: "تم لوگ ہو کس خیال میں، جو شخص تمھاری طرف لشکر لے کر آ رہا ہے وہ زبردست جنگ جُو ہے۔"

اس پر بنو طے کے لوگوں نے کہا: "آپ ایسا کریں کہ خالد (رضی اللہ عنہ) کے لشکر کو کچھ دن کے لیے روک لیں، تاکہ ہمارے جو لوگ طلیحہ کے پاس بزاخہ گئے ہوئے ہیں، ہم انھیں واپس بلا لیں، ورنہ طلیحہ انھیں قتل کروا دے گا۔"

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے ان کی یہ درخواست قبول کر لی۔ اور مقام سخ پر آئے۔ وہاں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کے ساتھ موجود تھے۔ عدی رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا:

"آپ قبیلہ بنو طے کو تین دن کی مہلت دے دیں۔ اس دوران میں بڑے بڑے جنگ جُو آ کر ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔"

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس بات کو قبول کر لیا۔

قبیلہ بنو طے نے انتہائی سمجھ داری سے اپنے لوگوں کو بزاخہ سے واپس بلا لیا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر اِسلام قبول کر کے لشکرِ حق میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے قبیلہ جذیلہ پر لشکر کشی کا ارادہ فرمایا۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر فرمایا:

''ذرا ٹھہر جایئے اور جلدی مت کیجیے۔ میں ایک دفعہ انھیں بھی اسلام کی دعوت دے دوں۔''

''اچھی بات ہے۔'' حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ قبیلہ جذیلہ کے پاس گئے اور جا کر اُنھیں اسلام کی دعوت دی۔ وہ لوگ بھی تھوڑی سی کوشش سے مان گئے اور اِسلامی لشکر میں شامل ہو گئے۔ یوں اسلامی لشکر میں ایک زبردست اضافہ ہو گیا۔ حضرت عدی رضی اللہ عنہ کی خوب تعریف ہوئی، کیوں کہ ان کی فہم و فراست کا ہی نتیجہ تھا کہ بغیر ذرا سی بھی جنگ کے اس قدر بڑی کام یابی حاصل ہو گئی تھی۔

ان شان دار کام یابیوں کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بزاخہ کے مقام کی طرف پیش قدمی فرمائی، جہاں طلیحہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مقابلے کی تیاری کر رہا تھا۔ طلیحہ کے ساتھ عینیہ بن محصن فزاری اپنے قبیلے کے سات سو لوگوں کے ساتھ موجود تھا، جب کہ قبیلہ قیس اور بنو اَسد بھی اس کے ساتھ تھے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دشمن کی جاسوسی کے لیے عکاشہ بن محیصن اور ثابت بن ارقم رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ دشمن کو اُن کے آنے کی اطلاع ہو گئی، اس لیے اس نے ان دونوں حضرات کو قتل کر دیا اور اُن کے جسد خاکی بیچ راہ میں ہی چھوڑ دیے۔ اسلامی لشکر جب وہاں پہنچا تو اُن کی لاشوں کو دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوا۔ آگے ہی بزاخہ کا میدان تھا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کو آگے بڑھایا۔ بزاخہ کے میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انھیں اسلام کی دعوت دی۔ ان لوگوں نے غرور میں وہ دعوت ٹھکرا دی۔ اس پر جنگ شروع ہو گئی۔ طلیحہ کی فوج نے اس سے کہا:

''مسلمان ہم پر حملے کر رہے ہیں، اس لیے اب آپ اللہ تعالیٰ سے کہیں کہ فرشتوں کو نازل فرما کر ہماری مدد فرمائے اور دشمن کو نیست و نابود کر دے۔''

طلیحہ حملے کی خبر سن کر اپنے خیمے میں بیٹھ گیا۔

جنگ شروع ہوئی تو عینیہ کو اِحساس ہوا کہ مسلمان اس کے لوگوں پر بھاری پڑ جائیں گے، اس لیے وہ خیمے میں طلیحہ کے پاس گیا اور پوچھا:

''جنگ کے متعلق کوئی وحی آئی؟''

طلیحہ نے جواب دیا: ''نہیں! ابھی وحی نہیں آئی۔ تم جنگ کرو، میں وحی کا انتظار کر رہا ہوں۔''

عینیہ یہ جواب سن کر میدان جنگ میں واپس آ گیا اور اپنے ساتھیوں کو لڑانے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ خیمے میں گیا اور پوچھا:

''ہاں، کیا خبر ہے؟ جبرئیل آئے یا نہیں؟''

''نہیں!'' طلیحہ نے جواب دیا۔ ''ابھی نہیں آئے، جنگ جاری رکھو۔''

عینیہ پھر میدان جنگ میں آ گیا۔ آخر اُسے شکست کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ تیسری بار طلیحہ کے پاس آیا اور کہنے لگا:

''جبرائیل کب آئیں گے؟ بخدا! مسلمانوں کے مقابلے میں ہماری طاقت جواب دے رہی ہے۔''

طلیحہ نے جواب دیا: ''جبرائیل آئے تھے۔''

شاید وہ بار بار عینیہ کے آنے کی وجہ سے پریشان ہو گیا تھا، اس لیے اس نے جبرائیل علیہ السلام کے آنے کا کہہ دیا۔

یہاں یہ بات بھی نوٹ کرنے سے تعلق رکھتی ہے کہ طلیحہ پہلے لوگوں کو کہا کرتا تھا کہ جبرائیل علیہ السلام ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں اور اُسے مشورے دیتے رہتے ہیں اور اَب وہ وحی کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ طلیحہ کے بیان میں کس قدر بڑا تضاد تھا اور وہ کس قدر جھوٹا شخص تھا۔

''پھر کیا بتایا جبرائیل نے؟'' طلیحہ کے جواب پر عینیہ بن محصن نے سوال کیا۔

''جبرائیل نے کہا ہے کہ یہ لڑائی تمھارے لیے چکی کا پاٹ ثابت ہو گی۔ عینیہ کے لیے یہ ایسا واقعہ ہو گا کہ وہ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔ یہ جنگ اس کے لیے بھی ایسی ہی سخت ہو گی جیسی کہ خالد کے لیے سخت ہے۔'' طلیحہ نے جواب دیا۔

اس کی بات سن کر عینیہ کو اِحساس ہو گیا کہ وہ ایک جھوٹے شخص کا ساتھ دے رہا ہے۔ اس نے طلیحہ سے کہا:

''مجھے تمھاری باتوں سے معلوم ہو رہا ہے کہ تم بالکل ہی جھوٹے شخص ہو۔ جب سے جنگ شروع ہوئی ہے تم یہاں خیمے میں بیٹھے ہو۔ تم نبی نہیں ہو سکتے۔ اگر نبی ہوتے تو اِس وقت اپنے امتیوں کے ساتھ ہوتے۔ تم کیسے نبی ہو، تمھارے امتی تمھارے نام پر کٹ رہے ہیں اور تم یہاں آرام سے بیٹھے ہو۔ میں تو پچھتا رہا ہوں کہ میں نے تیری حمایت کیوں کی۔''

عینیہ یہ کہہ کر باہر نکلا اور اپنے ساتھیوں کو اِکٹھا کر کے کہنے لگا:

''بھائیو! طلیحہ ایک جھوٹا شخص ثابت ہوا ہے۔ اس کے پاس کوئی فرشتہ

نہیں آتا اور نہ ہی وہ کوئی نبی ہے، اس لیے اپنی جانیں بچا کر یہاں سے بھاگ چلو۔ ایسا نہ ہو کہ ہم لوگ بے موت مارے جائیں۔''

اپنے سردار کا حکم سن کر عینیہ اور اُس کے ساتھی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ان کے میدان سے جاتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ تمام مرتد بھاگتے ہوئے طلیحہ کے پاس آئے اور پوچھا: ''اب ہم کیا کریں؟''

طلیحہ فوراً اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر بولا:

''تم لوگ بھی بھاگ جاؤ۔''

اس پر تمام لوگ میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یوں فتح مسلمانوں کی ہوئی۔ طلیحہ کے ماننے والے تمام لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یوں ان کی جان خلاصی ہوئی۔

طلیحہ بھاگ کر سیدھا شام پہنچا۔ وہاں اسے اطلاع ملی کہ: اس کا قبیلہ بنو اَسد اور بنو غطفان مسلمان ہو گئے ہیں۔ اس نے شام کے لوگوں سے پوچھا:

''اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو کیا امیر المومنین مجھے معاف کر دیں گے؟''

''ہاں معاف کر دیں گے۔''

لوگوں نے اسے اطمینان دلایا تو وہ بھی مسلمان ہو گیا اور بنو کلب میں آ کر رہنے لگا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں طلیحہ نے عمرہ کیا تو اُس کا گزر مدینہ منورہ سے بھی ہوا۔ لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بتایا:

''طلیحہ اب بھی زندہ ہے۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اب اس کے خلاف کچھ نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب خلافت کی ذمے داریاں سنبھالیں تو طلیحہ ایک بار پھر عمرہ کرنے کے لیے مکہ مکرمہ آیا۔ واپسی پر اُس نے مدینہ منورہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں طلیحہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے خواہش ظاہر کی کہ ''مجھے بیعت کر لیں۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''طلیحہ! چوں کہ تم عکاشہ اور ثابت (رضی اللہ عنہما) کے قاتل ہو، اِس لیے میں تمھیں پسند نہیں کر سکتا۔''

عکاشہ اور ثابت رضی اللہ عنہما کو طلیحہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لیے اپنے لشکر کی جاسوسی کرنے پر شہید کر دیا تھا، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات کہی تھی۔

طلیحہ نے کہا:

''امیر المومنین! آپ ایسی شخصیات کا غم کیوں کرتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھوں شہادت عطا فرمائی۔''

طلیحہ کی گفتگو سن کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس سے بیعت لے لی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا:

''اے طلیحہ! یہ تو بتاؤ کہ تم نے کیسے اپنی من گھڑت وحی میں نماز کا مذاق اڑایا تھا؟''

طلیحہ نے ندامت سے جواب دیا:

''امیر المومنین! وہ تو کفر کے فتنوں میں سے ایک فتنہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس فتنے کو مجھ سے دور فرما دیا ہے۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پھر اُس سے پوچھا:

''طلیحہ! تُو بڑا شعبدہ باز اور چالاک شخص تھا۔ بتا، اب تجھ میں کچھ فن کاری باقی ہے؟''

طلیحہ نے ندامت سے سر جھکا دیا:

''امیر المومنین! اب تو میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اب تو کچھ دم خم باقی نہیں رہا۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس سے رخصت ہو کر طلیحہ واپس اپنے قبیلے میں آ گیا اور اپنے گناہوں پر اِستغفار کرتا رہا۔ عراق میں ہونے والی جنگوں میں اس نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر بہت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ خصوصاً جنگ قادسیہ میں طلیحہ نے بڑی بہادری اور جواں مردی کے ساتھ لشکرِ اسلام کا ساتھ دیا کیا۔

ان جنگوں کے بعد طلیحہ کہاں گیا اور کب اس کی وفات ہوئی؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔

(ماخذ: جھوٹے نبیوں کا انجام (سید وارث علی کرمانی)
خلافت راشدہ قدم بہ قدم (عبداللہ فارانی)
بائیس جھوٹے نبی (نثار احمد خان فتحی)
جھوٹے نبی (ابوالقاسم رفیق دلاوری)

.....(جاری ہے).....

وہ عظیم تھا

الطاف حسین۔کراچی

اس کے چھوٹے چھوٹے بظاہر کمزور دکھائی دینے والے ہاتھ پُھرتی سے پہیے کو موٹر سائیکل سے الگ کرنے میں مصروف تھے اور جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔

''وہ کون تھا؟'' چودہ پندرہ سال کی عمر کا ایک بچہ! جو وقت سے بہت پہلے اس راستے پر آ نکلا تھا جس سے عمر کے لحاظ سے اس وقت اسے دُور، بل کہ بہت دُور ہونا چاہیے تھا۔

اس کی وجہ کیا تھی؟ اس کے ناتواں کندھوں پر ضرورت سے زیادہ یہ بوجھ کس نے اور کیوں لاد دیا تھا؟ اس وقت اسے صاف ستھرے کپڑوں میں اسکول میں ہونا چاہیے تھا، جب کہ وہ خستہ حال میلے کپڑے پہنے پنکچر لگانے کی کوشش کر رہا تھا اور یہی وہ سوال تھا، یہی وہ سوچ تھی جس نے میرے آگے بڑھتے قدموں کو روک لیا تھا، اور میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے قریب آ گیا۔

''کیا حال ہے بھئی!؟'' میں نے پیچھے سے اس کا دایاں کندھا تھپتھپاتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

''اچھا ہوں جی۔'' اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آواز میں پھیکی سی ہنسی کی جھلک نمایاں تھی۔ مجھے یوں لگا، جیسے اس کے الفاظ معاشرے کے بے حس وجود میں طنز کا نشتر بن کر اُتر رہے ہیں۔

''دوست! تمھارا نام کیا ہے؟'' میں نے بات کو آگے بڑھایا۔

''نام تو میرا اشرف تھا، لیکن وقت اور حالات نے پہچان مِٹا دی، اب لوگ مجھے ''شرفو پنکچر والا'' کے نام سے زیادہ جانتے ہیں۔'' اس کا جواب شکوے سے بھرپُور تھا۔

''آج صبح صبح ہی آغاز اچھا ہو گیا ہے؟'' میں نے ماحول کو بوجھل ہوتا دیکھ کر گفتگو کا رُخ بدل دیا۔

''سب اسی کا کرم ہے!'' اشرف نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''انسان تو خود کچھ نہیں ہوتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل نہ ہو۔''

وہ چھوٹا تھا، لیکن بات اپنی عمر سے بڑی کر گیا تھا!

''اشرف! تمھارے ابا کیا کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ابا!'' کہتے ہوئے اس کے لہجے میں زمانے بھر کا دُکھ سمٹ آیا۔ اس نے آنکھوں میں اُترنے والے سمندر کو روکنے کی بہت کوشش کی، ضبط کے کئی بند باندھے، لیکن دُکھ کا بہاؤ اِس قدر شدید تھا کہ اپنے آگے آنے والے ہر بند کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا! وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہا تھا! اسے روتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار میری آنکھیں بھی بھیگنے لگیں۔ شاید اُس کے اندر کا دُکھ میرے دِل میں بھی اُتر آیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اس کے جی کا بوجھ ہلکا ہوا تو اُس نے اپنے کُرتے کے میلے دامن سے آنسو پونچھتے ہوئے بات وہیں سے شروع کی جہاں سے سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ ''ابا کو ہم سے جُدا ہوئے تین سال ہو گئے ہیں۔ وہ بھی یہی کام کیا کرتے تھے۔''

''اشرف! تمھارے ابا کی وفات کا سُن کر مجھے دِلی دُکھ ہوا ہے۔ میری دُعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبر عطا فرمائے۔'' میں نے دعائیہ انداز میں کہا۔

''آمین!'' اشرف ٹیوب اُٹھاتے ہوئے بولا۔

اس کے رُکے ہوئے ہاتھ دوبارہ چل پڑے تھے۔ ٹیوب میں ہوا بھرنے کے بعد وہ اسے پانی سے بھرے چھوٹے سے ٹب میں ڈبو کر حرکت دیتے ہوئے ''پنکچر پوائنٹ'' تلاش کر رہا تھا۔

''تمھارے ساتھ اور کون کون رہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری امی اور دو چھوٹے بھائی، مقصود اور نوید۔'' اس نے ایک پنکچر پوائنٹ تلاش کر کے اس پر مار کر سے نشان لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''اس کام سے گزارا ہو جاتا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''اللہ کا شکر ہے جی! صبح سے شام تک محنت کرتا ہوں۔ دِل کو اِطمینان ہے کہ اپنے رزقِ حلال کما رہا ہوں۔'' وہ ٹیوب کو دوبارہ چیک کرتے ہوئے بولا۔

''دو وقت کی روٹی ہم ماں بیٹے عزت سے کھا لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری ضرورتیں بھی پوری ہو رہی ہیں۔ میری قسمت اچھی تھی جو مجھے اچھا استاد مل گیا۔ وہ بہت نیک انسان تھا۔ اس نے بڑی محبت اور ایمان داری سے مجھے کام سکھایا اور اُس کے بعد مجھے اپنی الگ دکان کھولنے کی اجازت بھی دے دی۔'' اشرف نے ٹیوب میں ایک اور پنکچر تلاش کر کے اس پر مار کر سے نشان لگاتے ہوئے کہا۔

''تمھارے چھوٹے بھائی تو پڑھ رہے ہوں گے؟'' میں نے یہ سوال کرتے ہوئے دِل ہی دِل میں مثبت جواب کی دعا بھی کی۔

''جی ہاں! اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور ماں کی دعا سے دونوں پڑھ رہے ہیں۔ ایک چھٹی جماعت میں ہے اور دوسرا چوتھی جماعت میں زیرِ تعلیم ہے۔'' اشرف اس دوران میں ٹیوب کو اچھی طرح چیک کرنے کے بعد اَب دو نشان زدہ پنکچر کی مرمت کرنے میں مصروف تھا۔

''ماشاء اللہ!'' میں نے خوشی سے کہا۔ ''کیا بناؤ گے انھیں؟''

''بنانے والی تو اللہ کی ذات ہے۔ میں تو کوشش کر رہا ہوں۔'' وہ انکساری سے بولا۔ ''میری خواہش ہے کہ دونوں بڑے آدمی بنیں، لیکن ایسے بڑے آدمی نہیں جو صرف نام کے بڑے ہوتے ہیں۔ میں انھیں صحیح معنوں میں اس مقام پر دیکھنا چاہتا ہوں جہاں بڑے واقعی بڑے ہوتے ہیں۔ لوگوں کی دِل سے خدمت اور مدد کرتے ہیں۔ آپ دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری کوششوں کو قبول فرمائے اور میرے بھائیوں کو ثابت قدم رکھتے ہوئے کام یابی کی اس منزل تک لے جائے جس کے خواب میری آنکھیں اکثر دیکھتی رہتی ہیں۔''

''آمین! آمین!'' میرے دِل کی گہرائیوں سے نکلا۔

''اشرف! تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اپنے بھائیوں کو کن پیشوں سے جوڑنا چاہتے ہو؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''مقصود کو تو ڈاکٹر بنانے کا پروگرام ہے۔ اسے میں نے سمجھا دیا ہے کہ ان ڈاکٹروں کے نقشِ قدم پر ہرگز نہ چلنا جو ڈگری لیتے وقت اپنے ملک و قوم کے بیماروں کی بے لوث خدمت کرنے کے دعوے تو کرتے ہیں، لیکن بعد میں اپنی کہی ہوئی باتوں پر عمل نہیں کرتے۔ دولت کی چمک انھیں اندھا کر دیتی ہے، وہ احساسات سے بالکل عاری ہو جاتے ہیں اور مجبور اور غریب لوگ ان کی فیس ادا کرنے کے قابل نہ ہونے کے باعث دَم توڑ جاتے ہیں۔'' اشرف جذبات کی رو میں بہتا چلا گیا۔

''نوید کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''اسے.....'' وہ دونوں پنکچر لگانے کے بعد ٹیوب کو ٹائر کے اندر داخل کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ تو اُستاد بنے گا۔ ہمدرد، قابل اور محنتی استاد، اپنے فرض کو پہچاننے اور نبھانے والا استاد۔ ویسا استاد نہیں جیسے مجھے اور آپ کو آج کل نظر آتے ہیں۔ جو ''ٹیوشن پڑھو گے تو پاس کریں گے'' کے فارمولے کے تحت ''کام'' کرتے ہیں۔ خود فائدہ بٹورتے ہیں اور دوسروں کو نقصان کے گڑھے میں دھکیل دیتے ہیں۔'' وہ ایک بار پھر جذبات کی رو میں بہہ نکلا تھا۔

''کیا اس طرح بچوں کا حق ادا کیا جاتا ہے؟ کیا یہی طریقہ ہے ان کے مستقبل کو روشن کرنے کا؟ یہ روشنی نہیں، میں اسے اندھیرا کہوں گا۔ سراسر دھوکا، نہ صرف بچوں کے ساتھ، بل کہ ان کے والدین اور سرپرستوں کے ساتھ، اس لیے میں اپنے دونوں بھائیوں کو اکثر سمجھاتا رہتا ہوں۔ بھائی جان! آپ بتائیے، میں جو کر رہا ہوں ٹھیک کر رہا ہوں نا!؟'' وہ باشعور بچہ میری طرف استفساریہ انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں ہاں، سو فی صد درست!'' میں نے جواب دیا۔

''بس آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انھیں کام یابی اور مجھے میرے خوابوں کی خوش گوار تعبیر دے دے، جو میں ایک عرصے سے اپنی آنکھوں میں سجائے ہوئے ہوں۔'' اشرف کام ختم کرنے کے بعد اَوزار سمیٹتے ہوئے بولا۔

''ان شاء اللہ!''

میں نے کہا اور پھر فرطِ جذبات سے بے قابو ہو کر اُس عظیم انسان کا ماتھا چوم لیا۔ اشرف واقعی عظیم تھا جو اپنا ''آج'' اپنے بھائیوں کے ''کل'' پر قربان کر رہا تھا۔ نفسا نفسی کے اس دور میں جہاں خلوص صرف نام رہ گیا ہو، خود غرضی عام ہو، حقوق کو صرف کاغذی کارروائی تک محدود کر دیا گیا ہو، جھوٹے دعوؤں اور وعدوں کا بازار گرم ہو، لوگوں کو طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر اپنے مزموم مقاصد حاصل کیے جا رہے ہوں، نعرے لگوا کر ''شان'' بڑھانا مقصد ہو، وہاں وہ ایثار اور وفا کا پیکر بڑے خلوص کے ساتھ اپنوں کے لیے جان لڑا رہا تھا۔

ایسا بہت کم لوگ سوچتے ہیں، بہت کم لوگ ایسا کرتے ہیں۔

خوشیاں عید کی

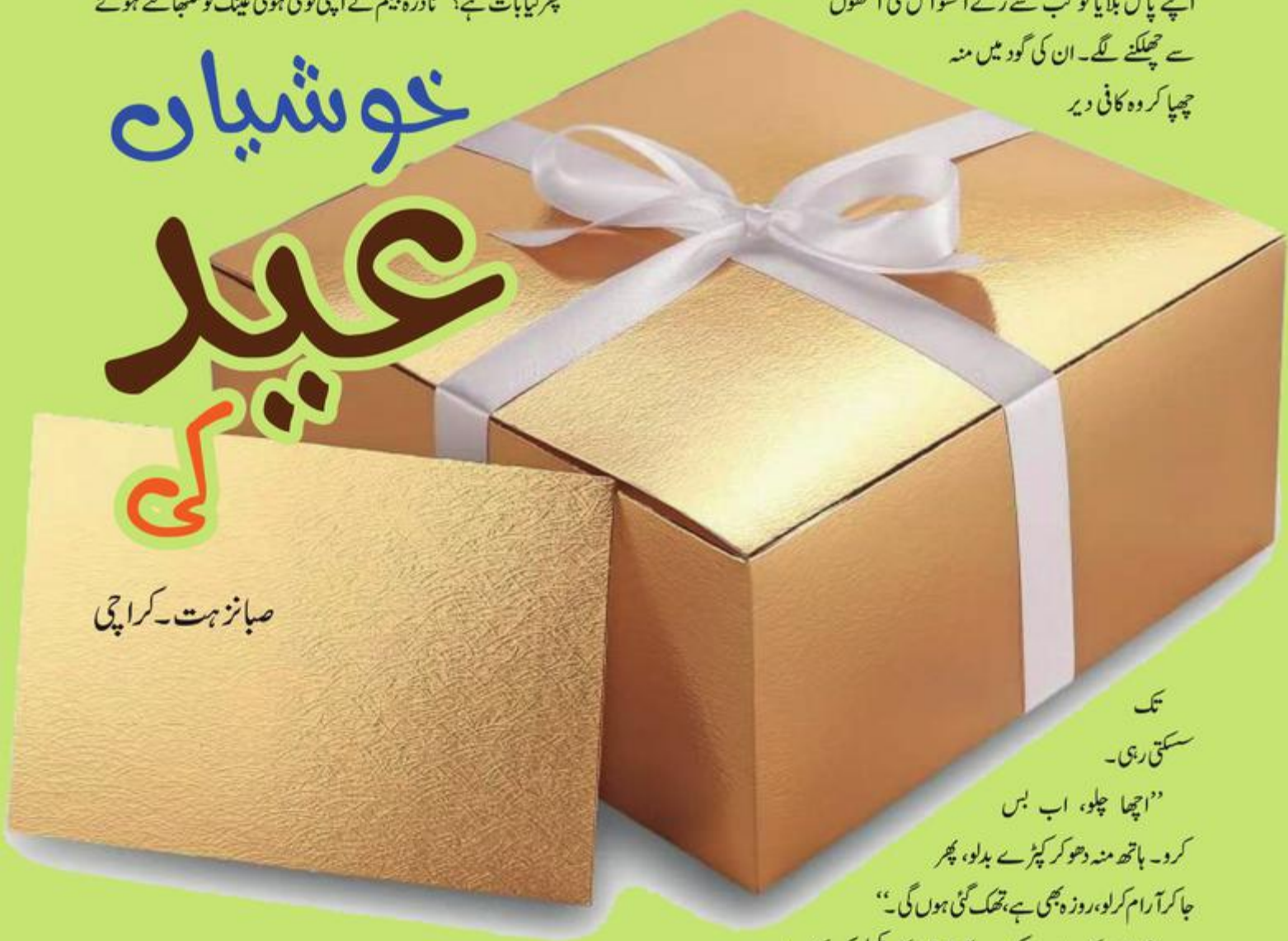

صبا نزہت۔ کراچی

وہ اسکول سے تھکی ہاری گھر لوٹی تو حسبِ معمول سلائی مشین کی گھڑگھڑنے اس کا استقبال کیا۔ مشین پر جھکی اماں کو دھیرے سے سلام کر کے بھاری بستہ بے دلی سے ایک طرف رکھ کر وہ کمرے میں موجود واحد چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس کے سلام کرنے کے انداز سے ہی نادرہ بیگم کو معلوم ہو گیا کہ آج پھر اُن کی لاڈلی بیٹی کا مزاج ٹھیک نہیں ہے۔ خلافِ توقع انھوں نے مشین پیچھے کھسکا کر اُسے اپنے پاس بلایا تو کب سے رُکے آنسو اُس کی آنکھوں سے چھلکنے لگے۔ ان کی گود میں منہ چھپا کر وہ کافی دیر تک سسکتی رہی۔

''اچھا چلو، اب بس کرو۔ ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلو، پھر جا کر آرام کرلو، روزہ بھی ہے، تھک گئی ہوں گی۔''

بانو خالہ کے سارے کپڑے آج شام تک مکمل کر کے دینا ضروری تھے۔ آج مہینے کی پانچ تاریخ تھی اور مالک مکان کرائے کے لیے کئی چکر لگا چکا تھا۔ بانو خالہ سے پیسے ملتے تو ہی وہ کرایہ ادا کر پاتیں۔ گھر میں کئی دن سے پکانے کو صرف دال چاول اور آلو ہی تھے اور سارہ کا اُداس چہرہ انھیں بتا رہا تھا کہ آج پھر فیس جمع نہ کرانے پر استانی نے اسکول سے نام خارج کرنے کا ڈراوا دیا ہوگا۔ وہ سوئی میں دھاگا ڈال رہی تھیں جب سارہ ان کے پاس آ بیٹھی۔

''استانی سے کہنا: ''نام نہ کاٹیں، میری امی تین چار دِنوں میں فیس ضرور جمع کروا دیں گی۔''

''یہ بات نہیں ہے۔'' سارہ نے گلابی بنارسی کپڑے کو اُنگلیوں میں مسلتے ہوئے کہا۔

''پھر کیا بات ہے؟'' نادرہ بیگم نے اپنی ٹوٹی ہوئی عینک کو سنبھالتے ہوئے نظریں اٹھا کر سارہ سے پوچھا۔

''عید آنے میں کتنے کم دن رہ گئے ہیں۔ کلاس میں سب لڑکیوں کے عید کے کپڑے بن گئے ہیں، مگر آپ ابھی تک میرے لیے کپڑے تک خرید کر نہیں لائیں۔''

''اوہ، تو یہ بات ہے!'' نادرہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا، مگر دِل ہی

دل میں وہ کچھ فکر مند بھی ہوگئیں۔

جب سے بانو خالہ اپنی پوتی رضیہ کے کپڑے سینے کے لیے دے کر گئی تھیں اس دن سے سارہ کو بھی اپنے کپڑوں کی بے چینی شروع ہوگئی تھی۔

رضیہ، سارہ کی کلاس فیلو تھی۔ دونوں میں دوستی بھی بہت تھی۔ جب تک اپنی ہر ایک بات دوسری کو نہ بتا دیتیں، تب تک چین سے نہ بیٹھتی تھیں۔ آج کل روزانہ کلاس میں لڑکیاں عید کی تیاری کا ہی ذکر کرتی رہتی تھیں۔ ایسے میں سارہ ان کے درمیان خاموش بیٹھی بس ان کی باتیں سنتی رہتی، مگر کچھ نہ بولتی۔ کہنے کے لیے پاس کچھ تھا بھی تو نہیں۔ وہ انھیں کیا بتاتی کہ ابھی اماں کو گھر کا کرایہ دینا ہے، ابا کی بیماری پر لیے گئے قرض کی قسط ادا کرنی ہے، نانی کی دوائیاں لانا بھی ضروری ہیں، گھر کا راشن بھی خریدنا ہے اور پھر عادل اور اُس کی کئی مہینوں سے ادا نہ کی گئی فیس بھی ادا کرنی ہے۔ اگر یہ سب کام ہو گئے، جو کہ تقریباً ناممکن تھے تو اِن اس کے بعد ہی اس کے لیے عید کا جوڑا خریدا جاسکتا ہے۔

چند سال پہلے تک سارہ کا گھرانا بھی خوش حال تھا۔ اس کے ابا درزی تھے۔ عام دنوں میں بھی وہ اچھا خاصا کما لیتے تھے۔ عید کے دن تو اُن کے سیزن کے دن ہوتے تھے۔ بدقسمتی سے دو سال قبل انھیں ٹی۔ بی ہوگئی۔ بروقت علاج میسر نہ آنے پر بیماری بڑھتی چلی گئی اور بالآخر وہ دنیا سے کوچ کر گئے۔ ابا کے انتقال کے بعد مشین اس کی اماں نے سنبھال لی اور پھر دو بچوں کی کفالت کرنے لگیں۔ ان کا ایک بھائی تھا، پر وہ خود غریب تھا اور مزید تین افراد کی کفالت اس کی استطاعت میں نہیں تھی۔ سارہ کے والد کے انتقال کے بعد نانی ان کے پاس آکر رہنے لگیں۔ نانی کی موجودگی سے نادرہ بیگم کو ڈھارس بندھی رہتی تھی۔

صبح سارہ کو اِسکول بھیج کر وہ چھوٹا بیٹا نانی کے پاس چھوڑ کر محلے والوں کے کپڑے سیا کرتیں۔

☆.....☆.....☆

انگلش کی کاپی میں سر دیے وہ بظاہر ٹیسٹ کی تیاری کر رہی تھی، مگر اُس کا سارا دھیان رضیہ، ارم اور فروہ کی باتوں کی جانب تھا۔ ان کے ایک نہیں، دو تین جوڑے عید کے لیے خریدے گئے تھے۔ ساتھ میں میچنگ کی چوڑیاں اور کلپ وغیرہ بھی اور رضیہ نے تو ایک چھوٹا خوب صورت سا پرس بھی خرید لیا تھا۔ تمام وقت وہ کلاس میں گم صم بیٹھی رہی، لیکن گھر آتے ہی وہ پھٹ پڑی۔

اس کی ہچکیاں مشین پر بیٹھی نادرہ کو بہت تکلیف دے رہی تھیں، جیسے کوئی ان کے دل پر آری چلا رہا ہو۔ ان کی تو پوری کوشش تھی کہ اگر دو چار سو روپے بھی بچ گئے تو وہ تھوڑا کپڑا لا کر جوڑ توڑ کر کے اُس کے لیے ایک قمیص ہی سی دیں گی، مگر رضیہ جیسا ریشمی فراک، جس کے گلے اور دامن پر بنارسی کپڑے کی پٹیاں لگی ہوئی تھیں، ایسا فراک سِینا ان کی استطاعت میں نہیں تھا۔

''سارہ بیٹی! ایک مزے کی بات بتاؤں۔'' نانی کی بات پر روتی ہوئی سارہ نے اپنا سر اُٹھا کر اِستفہامیہ نظروں سے انھیں دیکھا۔ ''اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، اللہ تعالیٰ سب کی دعائیں سنتے ہیں اور شکر اَدا کرنے پر نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں۔''

نانی کی باتوں نے سارہ کے غم گین دل کو سہارا دِیا۔

''چلو، ہاتھ منہ دھو کر آؤ، تاکہ ہم سب مل کر روزہ افطار کریں۔'' نانی نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر اُٹھ گئی۔ نادرہ بیگم اپنی اماں کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

مغرب کی نماز پڑھ کر سارہ نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ وہ مسلسل سوچے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پیار کرنی والی امی، بھائی اور نانی دیے ہیں، اگر وہ اکیلی ہوتی تو کتنی اداس ہوتی۔

☆.....☆.....☆

رمضان کا آخری عشرہ شروع ہوگیا تھا اور آج بچوں کا اسکول میں آخری دن تھا۔ سب سہیلیاں ایک دوسرے کے لیے عید کارڈ بنا کر لائی تھیں۔ سارہ نے بھی رضیہ، فروہ اور اِرم کے لیے خوب صورت عید کارڈ بنائے تھے۔ رضیہ نے سوائے سارہ کے سب کو عید کارڈز کے ساتھ تحفے دیے اور سارہ سے اس نے یہ کہا کہ تمھارا تحفہ میں شام کو اُمی کے ساتھ گھر آکر دُوں گی۔ اسکول سے واپس آکر سارہ کو شام ہونے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ افطار کے بعد وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئی ہی تھی کہ رضیہ اپنی امی کے ساتھ آگئی۔

اس کے ہاتھ میں سنہرے کاغذ میں لپٹا ایک بڑا سا ڈبا بھی تھا۔ جس کے اوپر ہاتھ سے بنا ایک خوب صورت کارڈ بھی تھا۔ رضیہ نے وہ ڈبا ایک مسکراہٹ کے ساتھ سارہ کو تھما دیا۔

''بہن! ہم تو کل ہی آنا چاہ رہے تھے، مگر رضیہ نے کارڈ نہیں بنایا تھا۔ آج وہ اسکول سے آکر سارہ دن بیٹھی سارہ کے لیے کارڈ ہی بناتی رہی۔'' رضیہ کی امی نے رضیہ کی بے چینی کا حال سنایا تو نادرہ بیگم مسکرانے لگیں۔

سارہ بڑے انہماک سے رضیہ کا بنایا ہوا کارڈ پڑھ رہی تھی۔

''اب بس کارڈ ہی پڑھتی رہو گی یا ڈبا بھی کھولو گی؟'' رضیہ نے شرارت

بھرے انداز میں پوچھا۔

''ارے..... یہ کیا!'' سارہ کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ ڈبے میں گلابی چوڑیوں، ہار بندوں کے علاوہ جوتوں کا ایک خوب صورت سا جوڑا بھی رکھا ہوا تھا۔ سلور جوتوں کے برابر میں ہی سلور رنگ کا ایک پرس تھا اور اِن سب چیزوں کے نیچے سلیقے سے تہ کیا ہوا وہ گلابی فراک رکھا ہوا تھا جس کے گلے اور دامن پر سلور کی چوڑی سی بنارسی پٹی لگی ہوئی تھی۔

گلابی فراک اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر سارہ کی خوشی سے چیخ نکل گئی۔ ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھ کر رضیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے چپ کیسے کروائے۔ نادرہ بیگم بھی آبدیدہ نظر آ رہی تھیں۔

''آنٹی! لگتا ہے، سارہ کو میرا تحفہ پسند نہیں آیا یا پھر شاید اُسے گلابی رنگ پسند نہیں ہے۔'' رضیہ نے مصنوعی غم گین صورت بناتے ہوئے کہا۔

''اچھا دیکھو، اگر تمھیں گلابی رنگ پسند نہیں ہے تو تم میرا نیلا فراک لے لو، میں گلابی لے لوں گی۔'' رضیہ کی پیش کش پر سارہ نے روتے روتے نفی میں سر ہلا دیا۔

نادرہ کی سمجھ میں اب پوری بات آ چکی تھی۔ رضیہ کی دادی بانو خالہ ایک جیسے دو فراک سینے کے لیے دے کر گئی تھیں۔ ایک گلابی اور ایک نیلا۔ گلابی فراک کے لیے انھوں نے کہا تھا کہ وہ اپنی ایک دوسری پوتی کے لیے سلوانا چاہتی ہیں جس کا قد کاٹھ سارہ جیسا ہے تو وہ اسے سارہ کے ناپ کے مطابق سی دیں۔ ان کی ہدایت کے مطابق نادرہ بیگم نے اسے ویسا ہی سیا تھا، لیکن اس وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یہ فراک سارہ کے لیے ہی سِلوا رہی ہیں۔

نادرہ بیگم کے بے حد شکریہ ادا کرنے پر رضیہ کی امی کہنے لگیں:

''بس مجھے شرمندہ نہ کریں، یہ تو میرا فرض تھا اور ویسے بھی رضیہ کی تو کوئی بہن ہی نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ سارہ جیسی اچھی بچی کی شکل میں میری بیٹی کو ایک بہن ملی ہوئی ہے۔''

''اور کیا آنٹی! اب جب ہم دونوں عید پر ایک جیسے کپڑے پہنیں گی تو بالکل بہنیں ہی لگیں گی نا!''

رضیہ نے چہکتے ہوئے سارہ کو گلے لگا لیا۔ رضیہ کے گلے لگی سارہ کی نظریں اپنی نانی کی طرف اٹھیں تو وہ بھی مسکرا رہی تھیں، جیسے کہہ رہی ہوں کہ دیکھا میں نہ کہتی تھی: اللہ تعالیٰ کا اپنے شکر گزار بندوں کی نعمتیں بڑھا دیتے ہیں۔

عزیز قارئین! آپ بھی اپنے آس پاس کا جائزہ لیں گے تو ایک نہیں کئی ایسے چہرے نظر آئیں گے جن کے چہرے کی مسکراہٹ اور عید کی خوشیاں آپ کی مدد کی محتاج ہیں اور عید کی اصل خوشی تو آپ کو تب ہی محسوس ہوگی جب آپ اس خوشی میں کسی دوسرے کو بھی شریک کریں گے۔

خوش خبری

مقابلۂ خوش خطی ۸

طلبا و طالبات کے لیے انعامات جیتنے کے مواقع

بارہ مہینے
بارہ انعامات

انعامات:

اول آنے پر 1000 روپے / دوم آنے پر 700 روپے

سوم آنے پر 500 روپے

مقابلے میں شریک ہونے کے لیے مندرجہ ذیل فن پارے کو لکھیے۔ جو قاری اس فن پارے کو عمدہ انداز میں لکھنے میں کام یاب ہو گیا، وہ انعام کا حق دار ہو گا۔

تو پھر دیر کس بات کی! اٹھائیے کاغذ اور قلم، کیجیے مشق..... اور ہمیں جلد از جلد ارسال کر دیجیے۔

مقابلے سے متعلق ضروری ہدایات:

☆ کمپیوٹر پیپر (A-4 سائز) صفحہ استعمال کیجیے۔

☆ فن پارے کو لکھنے کے لیے فونٹین پین، پنسل، کٹا ہوا پین اور کٹا ہوا مارکر استعمال کر سکتے ہیں۔

☆ کالی اور نیلی روشنائی استعمال کیجیے، کوئی اور رنگ بالکل استعمال نہ کیجیے۔

☆ صفحے کے چاروں جانب سے تقریباً ایک ایک انچ کا فاصلہ رکھ کر نمونہ تحریر کیجیے۔

زیر انتظام
شعبہ خوش خطی، البدر ہائر سیکنڈری اسکول

سُبحان اللہ

نوٹ: فن پارہ ۳۱ مئی ۲۰۲۱ء تک ہمیں موصول ہو جانا چاہیے۔ ایک فن پارہ ایک طالب علم کی طرف سے قبول کیا جائے گا۔ کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہو گا، جس پر اعتراض قابل قبول نہیں ہو گا۔ مقررہ تاریخ کے بعد وصول ہونے والے فن پارے مقابلے میں شریک نہیں کیے جا سکیں گے۔

تنگی کے بعد آسانی

؟_؟

وہ آج بہت پریشان تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ سبزی والے، گوشت والے اور دوسرے معاملہ رکھنے والوں کا مقروض تھا۔ سب اس سے بار بار پیسوں کا مطالبہ کررہے تھے، لیکن وہ اپنی غربت کی وجہ سے پیسوں کی ادائیگی سے قاصر تھا۔

ابوحسان اس بارے میں بہت پریشان تھا کہ کس طرح وہ ان سب کا قرض ادا کرے، اتنے میں اس کے غلام نے آکر بتایا کہ ایک خراسان کا رہنے والا شخص جو حج کے لیے جارہا ہے، اس سے ملنا چاہتا ہے؟ اس نے کہا:

''آنے دو۔'' خراسانی آیا، سلام کیا اور پوچھا:

''کیا آپ کا نام ابوحسان ہے؟'' ابوحسان نے کہا:

''جی ہاں!'' خراسانی بولا:

''میں ایک پردیسی ہوں اور میرا حج کا ارادہ ہے۔ میرے پاس دس ہزار درہم ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان پیسوں کو بطورِ امانت اپنے پاس رکھ لیں۔ حج سے واپسی پر میں یہ امانت آپ سے وصول لوں گا۔'' ابوحسان نے کہا:

''ٹھیک ہے، لائیے۔''

خراسانی نے وہ درہم وزن کرکے اور سیل لگا کر ابوحسان کے حوالے کردیے۔

ابوحسان نے سوچا کہ خراسانی جب آئے گا تو میں اسے پیسے کہیں سے حاصل کرکے دے دوں گا، ابھی میں ان پیسوں سے اپنی ضرورت پوری کرلیتا ہوں، لہٰذا اُس نے پیسوں کی سیل توڑی اور تمام قرض خواہوں کو اُن کے پیسے دے دیے۔ اب اس کے پاس فراخی ہوگئی تھی اور سکون حاصل ہوگیا تھا۔

اگلے دن صبح غلام نے آکر خبر دی کہ وہی خراسانی دوبارہ آیا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ ابوحسان نے کہا:

''آنے دو۔'' خراسانی آیا اور کہنے لگا:

''میں تو حج کے لیے جارہا تھا، لیکن اچانک میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، لہٰذا میں واپس اپنے شہر جارہا ہوں، اس لیے آپ میرے درہم واپس کردیں۔''

ابوحسان کہتے ہیں: ''میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں پریشان ہوگیا اور مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ میں سوچنے لگا کہ اس خراسانی کو کیا جواب دوں، پھر میں نے کہا: 'ٹھیک ہے، لیکن میرا یہ گھر محفوظ نہیں ہے، اس لیے وہ دراہم میں نے اپنے پہلے والے گھر میں رکھے ہوئے ہیں۔ آپ میرے پاس کل تشریف لائیے، میں آپ کو آپ کے درہم دے دوں گا۔''

جب وہ چلا گیا تو میں سوچنے لگا کہ اب میں کیا کروں۔ اگر میں دراہم کا انکار کروں گا تو وہ مجھے قسم دے گا اور میری دنیا اور آخرت کی رسوائی ہوگی اور اگر میں اسے اپنے پاس سے چلتا کرنے کی کوشش کروں گا تو وہ مجھ سے لڑ پڑے گا۔ رات ہوگئی، لیکن میں یہی سوچتا رہا کہ کل صبح خراسانی میرے پاس آئے گا تو میں اسے کیا جواب دوں گا۔ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ میں نے اپنے غلام سے کہا کہ ''میری سواری تیار کرو، مجھے باہر جانا ہے۔'' غلام نے کہا:

''ابھی تو اندھیری رات ہے۔ آپ کہاں جائیں گے؟'' میں واپس بستر میں آگیا۔ میں تین دفعہ اٹھا، لیکن غلام نے مجھے واپس بستر کی طرف لوٹا دیا۔

جب صبح ہوئی تو میں اپنی سواری پر سوار ہوا۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے؟ میں نے سواری کی لگام چھوڑ دی کہ جہاں چاہے یہ سواری چلی جائے، یہاں تک کہ میں ایک پل تک جا پہنچا۔ پل کے دائیں جانب گورنر کا گھر تھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ اچانک ایک شہ سوار میرے پاس آیا اور مجھے دیکھ کر چلا گیا، پھر دوبارہ لوٹا اور مجھ سے کہا:

کیا آپ ابوحسان زیادی ہیں؟ میں نے کہا: ''ہاں۔'' اس نے کہا:

''گورنر حسن بن سہل آپ کو بلا رہے ہیں۔''

میں نے سوچا، گورنر کو مجھ سے پتا نہیں کیا کام ہے۔ میں شہ سوار کے ساتھ گیا اور اجازت ملنے پر اندر داخل ہوا۔ گورنر نے کہا:

''ابوحسان! آپ کا کیا حال ہے اور کیوں آپ ہم سے ملنے نہیں آتے؟''

میں نے کہا: ''میں مصروف تھا۔''

پھر گورنر نے کہا: ''اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تم کسی مصیبت یا اہم معاملے میں پھنسے ہو، وہ کیا ہے؟ اس لیے کہ میں نے خواب میں تمھیں پریشان دیکھا ہے۔''

گورنر کی یہ بات سن کر میں نے شروع سے لے کر اُس کے پاس آنے تک کا پورا واقعہ اسے سنا دیا۔ گورنر نے کہا:

''ابوحسان! اللہ تعالیٰ نے تمھاری پریشانی کو دُور کردیا۔ یہ ایک تھیلی رکھو خراسانی کی تھیلی کے بدلے میں اور یہ دوسری تھیلی بھی رکھو، اس سے اپنی ضروریات پوری کرنا اور جب یہ ختم ہوجائے تو ہمیں بتانا۔''

میں خوشی خوشی واپس لوٹا اور خراسانی کو اُس کے پیسے لوٹائے اور میں مال دار ہوگیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پریشانی کو دُور فرمایا۔

(ایک سچا واقعہ، ماخوذ از: تاریخ خطیب بغداد)

میرے اچھے بابا

فرحین خرم ہاشمی۔ لاہور

''صادق! کہاں جارہے ہو؟'' فرحین نے بیٹے کو گھر کا بیرونی دروازہ کھولتے دیکھ کر غصے سے پوچھا۔

''امی! تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔'' صادق نے جلدی سے کہا اور ماں کی بات سنے بغیر گھر سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد صادق کے بابا ممتاز احمد گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں پھلوں وغیرہ کے تھیلے تھے۔

''حمنٰی، یمنٰی!'' ممتاز نے اپنی آٹھ سالہ جڑواں بیٹیوں کو آواز دی۔

''صادق!'' ممتاز احمد نے دوسری آواز چودہ سالہ بیٹے کو دی۔ دونوں بیٹیاں اندورنی کمرے سے بھاگتی ہوئی آئیں۔

''گرم سموسے لایا ہوں۔ جلدی سے پلیٹیں لے آؤ۔''

ممتاز احمد نے خوش گوار موڈ میں کہا۔ دونوں بچیاں باورچی خانے کی طرف بھاگیں اور فرحین سے پلیٹیں لے کر واپس برآمدے میں آگئیں۔

''صادق کہاں ہے؟'' ممتاز احمد نے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔

''بابا! بھائی، امی کو بتائے بغیر گھر سے باہر چلے گئے ہیں۔'' یمنٰی نے جلدی سے بتایا تو ممتاز احمد نے فرحین کی طرف دیکھا۔

''ابھی آجائے گا۔'' فرحین نے بیٹے کی طرف داری کی۔ ممتاز احمد نے کچھ کہا نہیں، مگر اُن کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں واضح تھیں۔

صادق مغرب کے بعد گھر لوٹا تو والد کو منتظر پایا۔

''کہاں گئے تھے؟'' ممتاز صاحب نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے۔'' صادق نے کہا۔

''بغیر بتائے؟'' ممتاز احمد نے سوال کیا۔

''امی کو بتایا تھا۔'' صادق نے کہا۔

''صادق بیٹے! میں تمھارے کھیلنے کے خلاف نہیں ہوں، مگر اجازت لے کر جایا کرو اور مغرب سے پہلے گھر واپس آجایا کرو۔'' ممتاز احمد نے سمجھایا۔

''بابا! آپ ہر بار یہی کہتے ہیں، لیکن کھیلنے میں دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔'' صادق نے کہا۔

''میں تمھارے بھلے کے لیے کہتا ہوں۔''

ممتاز احمد نے سنجیدگی سے کہا، مگر صادق نے باپ کی بات پر توجہ نہیں دی۔ صادق اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے بہت ضدی اور خودسر ہو گیا تھا۔ فرحین کے زیادہ لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا تھا۔ فرحین اس کی حرکتوں پر پردہ ڈالتی رہتی، جس کی وجہ سے صادق کو شہ مل رہی تھی۔ وہ ہر بات میں اپنی من مانی کرنے لگا تھا۔ ممتاز احمد اکثر اُسے نصیحت کرتے، پیار سے سمجھاتے، مگر صادق، والد کی بات کو سمجھنے کے بجائے ان کی باتوں سے چڑنے لگا۔ وہ ہمیشہ والد کی باتوں کے برعکس کام کرتا۔ ممتاز احمد کو اُس کے رویے سے بہت شکایت تھی، مگر وہ نرمی اور پیار سے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے رہتے۔ ایک دن صادق اسکول سے واپس آیا تو آتے ہی ماں سے ضد کرنے لگا:

''امی! ہمارے اسکول والے گھومنے کے لیے جارہے ہیں، مجھے بھی جانا ہے، اس لیے مجھے تین ہزار روپے چاہییں۔'' صادق نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! تمھارے بابا سے بات کروں گی۔'' فرحین نے کہا۔

''مجھے کچھ نہیں پتا! مجھے پیسے چاہییں۔'' صادق ضد کرنے لگا۔

رات کو کھانے کے بعد جب وہ سب برآمدے میں بیٹھے تھے تو فرحین نے صادق کے اسکول کی تفریح کے بارے میں بتایا۔ ممتاز احمد سوچ میں پڑ گئے۔

''مہینے کے آخری دن ہیں، تنخواہ پہلی کو ملے گی۔ تین ہزار روپے کہاں سے لاؤں؟'' ممتاز صاحب نے خود کلامی کی۔

''بابا! آپ ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ میری کوئی خواہش کبھی پوری نہیں کرتے۔ سب کے بابا اپنے بچوں کو اِتنا کچھ لے کر دیتے ہیں اور آپ ہمیشہ بہانے بنا دیتے ہیں۔'' صادق غصے سے کہنے لگا۔ ممتاز احمد اور فرحین حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

''صادق بیٹا! میری بات سنو۔'' ممتاز احمد نے سنجیدگی سے اسے پکارا۔

''مجھے کچھ نہیں سننا۔''

صادق نے بدتمیزی سے کہا اور غصے سے بھرا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اگلے دن صادق اسکول گیا تو بہت اداس تھا۔ اس کے سب دوست تفریح پر جارہے تھے، انھوں نے رقم جمع کروادی تھی۔ حسبِ معمول صادق اپنے دوستوں کو گھر کی سب باتیں بتانے لگا کہ اس کے بابا تفریح پر جانے سے منع کررہے ہیں۔ سب دوست بظاہر تو صادق کی باتیں سُن کر افسوس کررہے تھے،

مگر پیٹھ پیچھے وہ صادق کا مذاق اڑانے لگے۔ صادق کے والد نے اسے کئی بار منع کیا تھا کہ گھر کی باتیں باہر مت کیا کرو۔ اس کا فائدہ دوست نما دشمن ضرور اُٹھاتے ہیں، مگر صادق باپ کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔

مزید دو دِن اسی پریشانی میں گزر گئے۔ جس دن پیسے جمع کروانے کا آخری دن تھا فرحین نے صبح سویرے ہی صادق کو تین ہزار روپے دے دیے۔ صادق خوشی سے اچھلتا پیسے لے کر اسکول چلا گیا۔ اس نے ماں کا بجھا ہوا اُداس چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس دن اس کے بابا صبح سویرے کام پر چلے گئے تھے۔ صادق نے اسکول پہنچ کر فوراً پیسے جمع کروائے اور اَب وہ دوستوں کے ساتھ مختلف منصوبے بنانے لگا۔ صادق بہت خوش تھا، اسی خوشی کے ساتھ جب وہ اسکول سے واپس آیا تو برآمدے میں والدین کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر رُک گیا۔

''آپ نے پیسے ادھار کیوں لیے؟'' فرحین فکرمندی سے کہہ رہی تھی، جب کہ ممتاز صاحب سر جھکائے کسی سوچ میں گم تھے۔

''میرے لیے اپنے بیٹے کی خوشی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔'' ممتاز احمد نے کہا۔

''مگر آپ پر پہلے ہی بہت قرض ہے۔'' فرحین نے فکرمندی سے کہا۔

ممتاز احمد گہری سانس لے کر رہ گئے۔ صادق کو دروازے سے اندر آتا دیکھ کر وہ خاموش رہے۔ صادق خاموشی سے امی، بابا کو سلام کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ صادق جانتا تھا کہ اس کے والدین اکثر پریشانی سے ذکر کرتے رہتے ہیں کہ حالات بہت خراب چل رہے ہیں۔ ممتاز احمد جس کمپنی میں کام کرتے ہیں وہ خسارے میں جا رہی ہے، اس لیے کمپنی نے سب ملازموں کی تنخواہوں میں کٹوتی کر دی ہے۔ ممتاز احمد جیسے متوسط طبقے کے افراد کے لیے عزت کے ساتھ وقت گزارنا بہت مشکل ہو رہا ہے۔ صادق کو کچھ دیر تو اپنے ضد کرنے پر افسوس ہوا، مگر تھوڑی دیر بعد وہ سب کچھ بھول کر تفریح پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

اگلے ہفتے اسکول والے پُرفضا پہاڑی مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔ سب بچے بہت پُرجوش

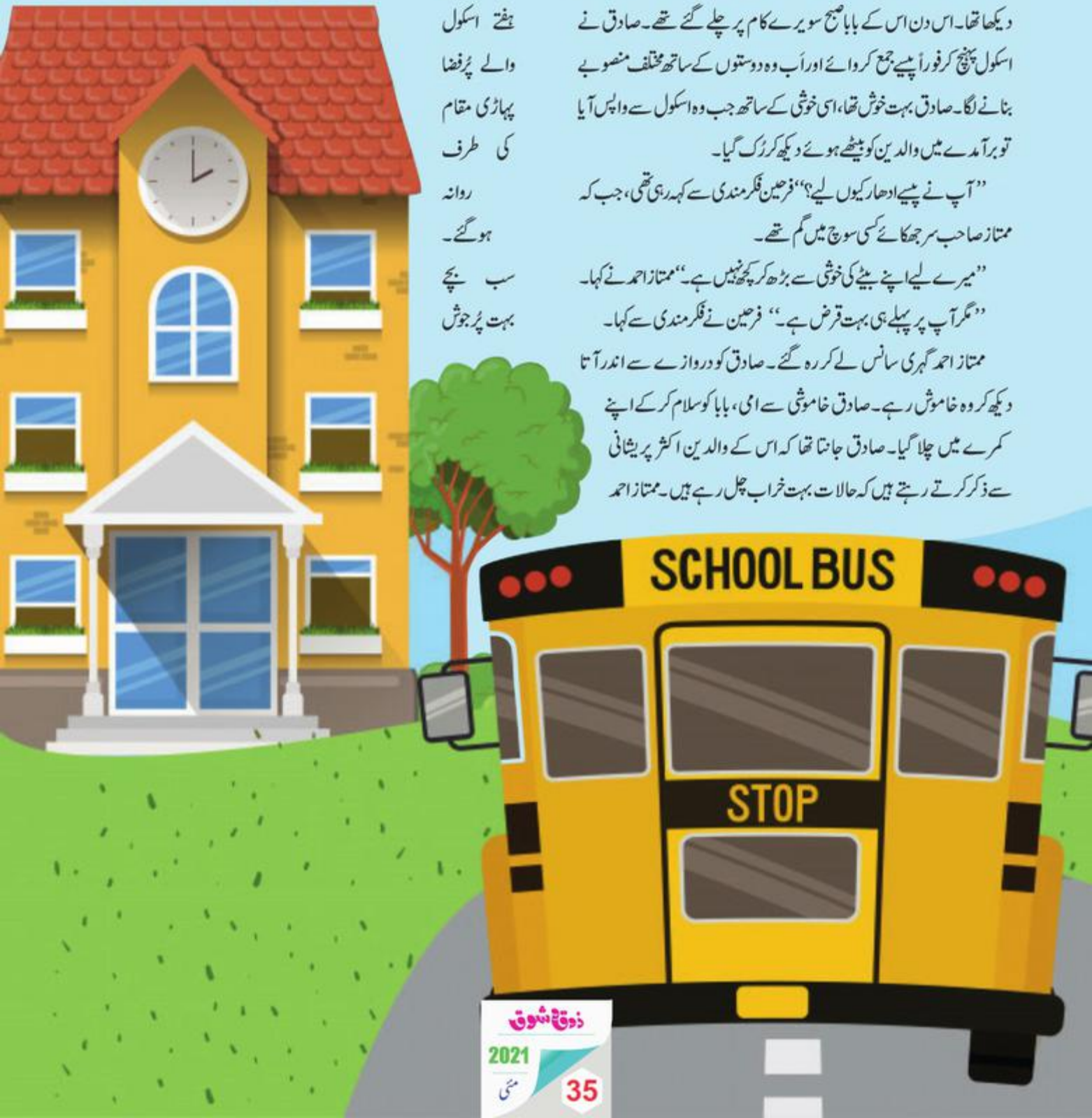

تھے۔ سارا راستہ ہنستے مسکراتے گزر گیا۔ پُرفضا مقام پر پہنچ کر سب کھیل کود میں لگ گئے۔ جب کھیل کر تھک گئے تو سب دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔

کھانے کے بعد سر جمیل نے بچوں میں مقابلے کا اعلان کیا۔ اول آنے والے بچے کو اِنعام میں پانچ سو روپے ملیں گے۔ سب بچے خوش ہو گئے۔ کسی بچے نے نظم سنائی، کسی نے لطیفہ سنایا، کسی نے اقوال زریں اور کسی بچے نے چھوٹی سی کہانی سنائی۔

مگر اِنعام ملی نغمہ سنانے والے ایک بچے کو ملا۔

سر جمیل نے اگلا سوال کیا:

''کل میں نے آپ سب کو ایک حدیث سنائی تھی۔ کسی بچے کو یاد ہے؟'' سر جمیل نے مسکرا کر پوچھا۔

''مجھے یاد ہے۔'' اچانک صادق نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ سب بچے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''رب کی رضا والد کی رضا میں ہے اور رَب کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے۔''

(سنن ترمذی)

''شاباش! پانچ سو روپے کا انعام صادق کے لیے۔''

سر جمیل نے پانچ سو روپے صادق کو دیتے ہوئے کہا تو صادق کے کچھ دوست حسد کا شکار ہو گئے۔

''اچھا یہ بتائیں کہ کیا آپ سب اپنے اپنے والد کا اَدب کرتے ہیں؟ ان کی ہر بات مانتے ہیں؟''

سر جمیل نے مسکرا کر پوچھا تو سب بچوں نے جلدی سے سر ہلائے۔

''سر! صادق اپنے ابو کی بات نہیں مانتا، ان سے ہر بات میں ضد کرتا ہے۔''

فخر نے اچانک کہا تو سب صادق کی طرف دیکھنے لگے، صادق کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

''ایسا نہیں ہے۔'' صادق نے شرمندگی سے سر جھکا کر کہا۔

''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کے بابا نے منع کیا تھا کہ تفریح پر مت جاؤ، مگر یہ اپنے بابا کو ناراض کر کے چلا آیا اور.....''

اس کے وہ دوست جن سے وہ اپنے دل کی ہر بات کر لیتا تھا، آج سب کے سامنے اس کے راز کھول رہے تھے۔ صادق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''بُری بات ہے! کسی کے رازِ محفل میں نہیں بتاتے۔''

سر جمیل نے ٹوکا، پھر سب بچے کھیلنے لگے، مگر صادق اداس سا ایک طرف بیٹھ گیا۔

اچانک موسم خراب ہونے کی وجہ سے سب بچوں کو جلدی سے بس میں بیٹھنے کا کہا گیا تو بچے بھاگتے ہوئے بس میں سوار ہو گئے۔ واپسی کے سفر میں صادق بالکل چپ تھا۔ راستے میں بس خراب ہو گئی۔ رات کا اندھیرا بڑھ گیا۔ سب بچے بہت پریشان تھے، جب کہ اساتذہ انھیں تسلی دے رہے تھے اور بچوں کے والدین سے مسلسل رابطے میں تھے۔

''فخر! آپ تو کہہ رہے تھے کہ صادق کے بابا اسے تفریح پر نہیں آنے دے رہے تھے، جب کہ سب سے زیادہ فون کالیں صادق کے بابا کی آئی ہیں۔ وہ صادق کے لیے بہت فکرمند ہیں، بل کہ صبح سے کئی بار فون کر کے صادق کا خیال رکھنے کا کہہ چکے ہیں۔''

سر جمیل نے نرمی سے کہا تو فخر شرمندہ ہو گیا۔ سب بچے رشک بھری نگاہوں سے صادق کی طرف دیکھنے لگے۔ بس ٹھیک ہو کر چل پڑی۔

جب بس اسکول کے دروازے پر پہنچی تو بچوں کے والدین میں سب سے آگے ممتاز صاحب کھڑے تھے۔ جیسے ہی بس رکی صادق تیزی سے نیچے اترا۔ ممتاز صاحب نے اسے دیکھتے ہی بازو پھیلائے تو صادق بھاگتے ہوئے اپنے بابا کے گلے لگ گیا۔ سب بچے اور اُستاد حیرت اور خوشی سے ان دونوں کو دیکھنے لگے۔

''صادق کے بابا تو بہت اچھے ہیں۔'' وہاں موجود سب لوگ کہہ رہے تھے۔

''ہاں، میرے بابا سب سے اچھے ہیں۔'' صادق نے بھیگی آنکھوں سے اعتراف کیا۔

اپنے باپ کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گھر جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کن الفاظ میں اپنے پیارے بابا سے معافی مانگے، جنھوں نے ہمیشہ اس کی فکر کی اور اُس کا خیال رکھا، مگر وہ ناسمجھی میں اپنے بابا کا دِل دکھاتا رہا تھا۔

''میں آئندہ کبھی اپنے پیارے بابا کا دِل نہیں دکھاؤں گا۔''

صادق نے سچے دل سے عہد کیا اور پھر آنے والے دنوں میں اپنے عہد کو نبھایا بھی۔ ممتاز صاحب، صادق کے رویے میں آئی تبدیلی دیکھ کر بہت خوش اور مطمئن تھے۔ ایک چھوٹی سی تفریح نے ان کے بیٹے کو یک سر بدل کر رکھ دیا تھا۔ بے شک یہ اللہ کا اُن پر خاص کرم تھا۔

قرآن کوئز ۹

سعد علی چھیپا۔ کراچی

عزیز قارئین! پیشِ خدمت ہے ایک نیا انعامی سلسلہ بنام ''قرآن کوئز''، جس میں آپ سے اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ''قرآن کریم'' کے بارے میں پانچ سوال پوچھے جائیں گے۔ صحیح جواب دینے پر آپ کو ملے گا بہترین انعام.....

تو دیجیے جواب اور لیجیے انعام.....

آپ کا جواب کوپن کے ساتھ ۳۱ مئی، ۲۰۲۱ء تک ہمیں مل جانا چاہیے۔

سوال

۱ قرآن مجید میں لفظ ''قرآن'' کتنی مرتبہ آیا ہے؟

۲ قرآن مجید کی کتنی سورتیں ایسی ہیں جن کے نام میں کوئی نقطہ نہیں ہے؟

۳ قرآن مجید کی کتنی سورتیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے شروع ہوتی ہیں؟

۴ قرآن مجید کی وہ کون سی سورت ہے جس کی ہر آیت ''دال'' پر ختم ہوتی ہے؟

۵ قرآن مجید کی کتنی سورتیں حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہیں؟

منّے کی عید

وزیہ ظفر۔ چکوال

عید والے دن اس کا لاڈلا بیٹا رو رہا تھا۔ وہ چپ کرا کرا کر تھک گئی تھی، مگر اُس کا بیٹا رو رو کر لال ٹماٹر کی مانند ہو گیا تھا۔

''چپ ہو جاؤ میری جان!''

اس نے نم آواز میں کہا۔ اس نے پورے تیس روزے رکھے تھے اور آج عید تھی۔ عید مومن کے لیے خوشی کا دِن ہوتا ہے اور خصوصاً جو روزے رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے احکام پورے کرتے ہیں، اس دن سے زیادہ ان کے لیے کوئی خوشی کا دن نہیں ہوتا، مگر صفیہ بیگم تو رو رہی تھی۔ اس کا لاڈلا مٹھائی کھانے کی ضد کر رہا تھا۔ وہ قصبے کی ساری دکانوں پر منّے کے ساتھ گئی اور منّے سے کہا:

''وہ جو چاہے لے لے، مگر روئے نہیں،'' مگر منّے کی تو ایک ہی ضد تھی، ویسی مٹھائی چاہیے جیسی مونا کھاتی تھی اور جو مونا کے پاس ہوتی تھی۔

اب مونا اور منّے کا بھلا کیا مقابلہ! وہ ایک کروڑ پتی باپ کی بیٹی اور منّا یتیم۔

''کاش میرے بیٹے! تم مونا سے نہ ملے ہوتے۔ کیوں لے گئی تھی میں تمھیں۔'' منّا اور شدت سے رو پڑا۔ صفیہ بیگم کا صبر جواب دے گیا اور وہ منّے پر برس پڑیں:

''تم کیوں نہیں سمجھتے۔ تم یتیم اور بے بس ماں کے بیٹے ہو۔ میں تمھاری خواہشات اور آرزوئیں پوری کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کر رہی، مگر تم عید والے دن بھی مجھے تنگ کر رہے ہو۔ خدا کے واسطے! منّے چپ ہو جاؤ۔''

صفیہ بیگم نے ڈانٹا۔ پانچ سالہ منّا اور شدت سے رو پڑا۔ بے بسی سے صفیہ بیگم نے اپنا سر تھام لیا۔

.....☆.....

روز کی طرح آج بھی صفیہ بیگم، ملک منصور کے گھر کام پر تنہا آئی تھی۔ وہ منّے کو ہمیشہ اپنے گھر سُلا کر ساتھ والی پڑوسن کو خیال رکھنے کی تاکید کر کے آتی تھی۔ ملک ہاؤس آتے ہی وہ برتنوں کے ڈھیر پر بیٹھ گئی۔ ملک صاحب کی فیملی بہت مہربان تھی۔ اس کا، بل کہ سب کام کرنے والوں کا خیال رکھتے تھے۔ اب بھی شیر بانو بی بی بہت محبت سے کہہ رہی تھیں:

''صفیہ! یہ کیا؟ آتے ہی کام پر لگ گئی ہو۔ تھوڑی دیر آرام کیا کرو۔ پیدل چل کر آتی ہو، تھک جاتی ہوگی۔''

اتنی محبت دیکھ کر صفیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ محبت کی ترسی عورت نما لڑکی محبت کے دو بول پر ہی مرمٹی اور دل کی گہرائیوں سے ملک صاحب کی فیملی کے لیے دعا کرنے لگی۔

''سنو صفیہ! بختاور بیٹی بھی آج آ جائے گی۔ روزے ہمارے ساتھ گزارے گی۔ ذرا گھر کی مکمل صفائی کر دینا۔ شہروز بیٹا بھی آ سکتا ہے۔''

''جی ٹھیک ہے بی بی جی!'' صفیہ نے تابع داری سے سر ہلایا اور صفائی میں جُت گئی۔ وہ جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی تھی۔ منّے کا خیال بھی تھا اور

اپنے گھر کی صفائی بھی کرنی اور راشن بھی لینا تھا۔ کل تو پہلا روزہ ہوگا اور روزے میں کام کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ مختلف سوچوں کے ساتھ وہ باورچی خانے کو مکمل طور پر صاف کر چکی تھی۔ باہر برآمدے اور کمروں کی جھاڑ پونچھ باقی تھی۔ اتنے میں گاڑی کی آواز آئی۔ ملک صاحب کی بیٹی اور داماد تشریف لا چکے تھے۔ وہ جرمنی سے سیدھے ملتان آئے تھے۔ ملک صاحب کی بیٹی بختاور جرمنی جا کر اور بھی نکھر گئی تھی اور ملک صاحب کی نواسی بہت ہی پیاری تھی۔ چھوٹے چھوٹے بالوں کی پونی باندھے انگریزی بولتی، منہ بسورتی حد سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔ ملک صاحب کے داماد گاڑی بھر کر سامان لاتے تھے۔ طرح طرح کے پھل، مٹھائیاں، خشک میوہ جات، کپڑے، جوتے، غرض ہر قسم کے لوازمات۔

''ملک صاحب کی طرح کیا بختاور کے سسرال والے بھی اتنے امیر ہیں۔''

وہ سامان کو دیکھ کر حیرت سے سوچنے لگی۔

''پاگل صفیہ!'' اس نے زور سے سر پر ہاتھ مارا۔ ''امیر، امیروں سے ہی رشتے جوڑتے ہیں۔ ملک صاحب اپنی لاڈوں پلی بیٹی کا رشتہ کیا تم جیسے غریبوں سے جوڑتے۔'' وہ عجیب کھوکھلی ہنسی ہنسی۔ وہ ملک منصور کے خاندان سے ہی تھی، مگر غریب رشتے داروں کو کوئی اپنا کہنے کو تیار نہیں، کوئی رشتے جوڑنے پر راضی نہیں۔ دولت بہت خود غرض بنا دیتی ہے۔

صفیہ بیگم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرے۔ اپنی غربت پر نہیں، بل کہ تنہا رہ جانے پر۔

''کاش! میرے پاس بھی دولت ہوتی تو آج بختاور بیٹی مجھ سے یوں منہ نہ موڑتی۔'' بختاور کا نظر انداز کرنا صفیہ کے دل پر لگا تھا۔

صفیہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ زیادہ امیر نہیں تو غریب بھی نہیں تھے۔ اچھا خاصا گزارا ہو جاتا تھا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی صفیہ، اکرام کے ساتھ بیاہ گئی۔ اکرام بھی محنت کش شریف نوجوان تھا۔ تنہا رہتا تھا۔ صفیہ کے والدین، اکرام اور صفیہ کو اپنے گھر لے آئے۔ کھیتوں کی دیکھ بھال سے اچھا خاصا گزارا ہو جاتا تھا۔ سب بہت خوش تھے۔ ایک ساتھ تھے۔ صفیہ جی جان سے والدین کی خدمت کرتی، اسی طرح اکرام بھی، اور صفیہ کے والدین کو اپنے فیصلے پر فخر محسوس ہوتا۔

اور پھر ایک دن صفیہ کے ابو پُرسکون نیند سوئے تو اُٹھ نہیں پائے۔ صفیہ کے لاکھ چیخنے چلانے پر بھی وہ نہ اُٹھے۔ وہ آواز دیتی رہی، تڑپتی رہی:

''ابو آنکھیں کھولیں نا!'' مگر ابو نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

وقت کا کام ہے گزر جانا۔ اچھا ہو یا بُرا، وقت کے لیے نہیں رُکتا اور وقت کے ساتھ انسان اس دکھ کے ساتھ جینا سیکھ جاتا ہے۔ صفیہ نے بھی جینا سیکھ لیا تھا۔

ننھے منّے کی آمد نے صفیہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے منّا ایک سال کا ہو گیا۔

اور ایک دفعہ پھر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس کی ماں، اس کی جنت اسے روتا، سسکتا، تڑپتا چھوڑ گئی۔ وہ پیروں میں بیٹھی ماں کی یاد میں سسکتی رہی۔ دن بھر ننھا منّا بھی نانی کی کمی شدت سے محسوس کرتا، گھر کے ہر ہر کونے میں تلاشتا اور آخر گلا پھاڑ کر چیخنے لگ جاتا۔ اپنا دکھ بھولے وہ منّے کے دکھ پر تسلی کے طور پر اُسے سینے سے لگا لیتی۔

نظامِ زندگی چلتا رہا۔ وہی گھر تھا، مگر اَفراد بدل گئے تھے۔ امی کی جگہ پر وہ آ گئی تھی۔ ابا کی جگہ پر اکرام۔ اسے ابا اماں کی محنت سے بھرپور زندگی یاد آتی۔ اماں ابا اس کی ہر ضرورت پوری کرتے تھے، مگر پھر بھی اپنے معاملے میں اور کبھی کبھی اس کے معاملے میں بھی کنجوسی کا مظاہرہ کر جاتے۔ اس نے سوچا کہ وہ، اکرام اور منّا، اماں ابا کی طرح زندگی ہنس کر گزاریں گے۔ اگر وہ محنت کریں گے تو اپنے لیے وسائل اور سہولت والی چیزوں پر خرچ بھی کریں گے، مگر کاتبِ تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اکرام کا بیٹھے بیٹھے دل گھبرا جاتا۔ چکر سے آنے لگ جاتے۔

''منّے کے ابو!'' صفیہ نے بہت اپنائیت سے کہا۔

''میرا مشورہ مانیں، شہر چل کر کسی بڑے ڈاکٹر سے چیک اَپ کروالیں۔ اماں ابا کے بعد اَب مجھ میں کچھ اور کھونے کی طاقت نہیں۔''

سسکتی روتی صفیہ کو چپ کراتا، حوصلہ دیتا اکرام شہر آ گیا۔ ڈاکٹر کی بات سُن کر اُس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے صفیہ اور منّے کا چہرہ تھا۔

اچانک سننے پر اکرام اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ وہ بلڈ کینسر کا مریض تھا۔ اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ مجبوراً ڈاکٹر نے اس کی جیب سے موبائل نکالا اور نمبر ملایا۔ ڈاکٹر بہت شرمندہ تھے:

''ہمیں مریض کو نہیں بتانا چاہیے تھا، مگر مجبوری تھی۔ اس کے ساتھ کوئی اور تھا بھی نہیں اور نہ وہ کسی اور کو لا سکتا تھا۔''

صفیہ کو نجانے کیسے خدا نے حوصلہ دیا کہ وہ بڑے تحمل سے ڈاکٹر کی بات سن رہی تھی۔

''آپ حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ یہ مرض بہت خطرنا ہے اور بھرپور توجہ مانگتا ہے۔''

''میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ ڈاکٹر صاحب! بس یہ ٹھیک ہو جائیں۔''

گھر، منا، اکرام، وہ سب کو بہت توجہ اور حوصلے سے دیکھتی۔

''آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ میں ہوں نا!؟ میں کچھ نہیں ہونے دوں گی آپ کو۔''

دن بدن کم زور ہوتے اکرام سے وہ بہت اپنائیت سے کہتی تو اکرام نم آنکھوں سے مسکرا پڑتا۔ وہ صفیہ کے حوصلے پر بہت خوش تھا۔

کہاں تو وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونے والی لڑکی اور کہاں اتنے بڑے دکھ کو تنہا جھیل کر اُسے بھی تسلی دیتی۔ ٹھوکریں انسان کو بہادر بنا دیتی ہیں۔ پے در پے پڑنے والے غموں نے صفیہ کو بھی بہادر بنا دیا تھا۔ صفیہ نے دن رات محنت کی۔ کینسر کے مرض نے جائیداد سے لے کر گھر کے برتن تک فروخت کروا ڈالے۔

''صفیہ! تمھاری بالیاں کہاں گئیں؟'' اکرام نے کم زور آواز میں پوچھا۔

''میں نے انھیں بیچ دیا۔'' صفیہ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

''کیوں فروخت کیا تم نے اُنھیں؟ وہ تمھاری اماں کی نشانی تھیں۔ تمھیں بہت عزیز تھیں ناں!؟''

''چھوڑیں جی! چیزوں کا کیا ہے، وہ تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ بس انسان کسی سے جدا نہ ہو۔ اماں کی نشانی سے زیادہ مجھے آپ کی صحت عزیز ہے۔ مرے ہوئے انسانوں کی خوشیوں سے زیادہ ہمیں زندہ انسانوں کی پروا کرنی چاہیے۔''

دن رات کی توجہ کے باوجود اِکرام کی صحت بگڑتی جا رہی تھی۔

''صفیہ! میرا سر پھٹ رہا ہے۔ خدا کے لیے دباؤ ہاتھوں سے۔''

پوری گلی میں اکرام کے رونے کی آوازیں جاتیں اور پھر ایک رات خاموشی چھا گئی۔

''محلے والے وقفے وقفے سے آئے۔ صفیہ مکمل خاموش تھی۔ رولو بہن! یوں چپ نہ بیٹھو، کلیجا پھٹ جائے گا۔ ہمارے ساتھ اپنا غم بانٹ لو۔''

ساتھ والی شبانہ نے اسے گلے لگایا، مگر وہ ٹس نہ ہوئی۔

''خدا کے لیے کچھ رولو بہن! ورنہ پاگل ہو جاؤ گی۔ اپنا نہیں تو کچھ منّے کا ہی خیال کر لو۔''

''منّا! میرا منّا!'' اس کے صبر کا دامن ٹوٹا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

اتنے بڑے گھر میں اب وہ تنہا رہ گئی تھی۔ زمین بک چکی تھی اور گھر اہم چیزیں ۔ اسے حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ ایک بار پھر اُسے اٹھنا ہوگا۔ وہ کتنی بار گری اور اُٹھی۔

ایک بار پھر سے زندگی اپنی ڈگر پر آ گئی تھی۔ منّے کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا وہ اپنے اوپر فرض سمجھتی۔

منّے کے اچھے مستقبل کی خاطر اُس نے ملک منصور کی حویلی میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ماں نے تاحیات کبھی اسے گھر کا کام بھی نہیں کرنے دیا تھا اور آج وہ دوسروں کے گھروں کے کام کر رہی تھی۔

یہی زندگی ہے۔ اسے ہی زندگی کہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونے والی صفیہ اب بڑی بڑی باتیں آسانی سے سہہ جاتی۔

''صفیہ! کدھر ہو؟ گندم کی کٹائی کی ہے ہم نے، آنا اور گندم لے جانا۔''

ساتھ والی بڑے غرور سے کہہ رہی تھی۔ صفیہ چپ تھی۔ اس کے ماں باپ ضرور مر گئے تھے اور وہ جوانی میں بیوہ بھی ہو گئی تھی۔ اس کا شوہر کوئی کروڑ پتی نہیں تھا، اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، مگر اِس حد تک تذلیل، بے عزتی وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں سلامت تھے۔ وہ محنت مزدوری کرے گی، اپنے اور منّے کے لیے۔

.....☆.....

''امی! مجھے قلفی کھانی ہے۔''

عشا کے بعد منّے نے فرمائش کی۔ وہ اپنی تھکن بھولے منّے کی فرمائش پوری کرنے کے لیے نکل پڑی۔ صبح پہلا روزہ تھا اور رمضان کے مہینے میں بھلا کیسے وہ اپنے منّے کی فرمائش رد کرتی۔ اس کے پاس جو کچھ تھا منّے ہی کا تو تھا۔ وہ اتنی محنت منّے کے لیے ہی تو کر رہی ہے، ورنہ اس کا تو زندگی سے جی اُٹھ گیا تھا۔ منّا خوش تھا۔ قلفی پا کر اور وہ منّے کی خوشی میں خوش تھی۔

اس کے لبوں پر خود بخود مسکراہٹ پھیل گئی۔ روزہ رکھ کر تلاوت مکمل کر کے وہ آج منّے کو ساتھ لے کر کام کے لیے نکل پڑی۔ باورچی خانے میں برتنوں کا ڈھیر اِس بات کا ثبوت تھا کہ سحری کے وقت انھیں استعمال کیا گیا ہے۔ برتن دھوتے دھوتے اس کی گردن اکڑ سی گئی، مگر شکوے کا ایک لفظ تک نہ نکلا۔ ملک صاحب کی بیٹی اور نواسی اٹھ چکی تھیں۔

''مجھے ملک نہیں پینا، مجھے کریم کھانی ہے۔ مجھے بلیک کریم نہیں، وائٹ کریم چاہیے۔''

ہاتھ میں کبھی ایک پیالہ پکڑتی، کبھی دوسرا، بختاور کافی زِچ نظر آ رہی تھی۔

میز پر طرح طرح کے لوازمات تھے، مگر بچی کافی ضدی تھی۔

''مجھے اسٹرابیری والا جوس پینا ہے۔''

فوراً اسٹرابیری جوس پیش کیا گیا۔ منہ کے ساتھ لگتے ہی ایک اور فرمائش کہ بغیر شوگر کے پینا ہے۔ بچی خود بھی نئے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی تھی اور ماں کو بھی پریشان کر رہی تھی۔ اچانک بچی کی نظر منّے پر پڑی جو نجانے کب وہاں آ گیا تھا۔ بچی نے خوش ہو کر دیکھا۔

بختاور نے خوش ہو کر منّے کو اپنے پاس بلایا۔ شرماتا لجاتا منّا بختاور کے پاس چلا گیا۔

''مما! اس سے میرا فرینڈ بننے کو کہیں نا!''

''چلو بیٹا! دوستی کرو بہنا سے۔''

مونا نے فوراً ہاتھ بڑھایا۔ منّے نے بھی شرماتے ہوئے ہاتھ آگے کر دیا۔

''ہوگئی دوستی، اب چلو بیٹا! جلدی سے ناشتا ختم کرو، پھر کھیلنا۔''

''مما!'' مونا نے ایک بار پھر منہ بسورا۔

''چلیں، ایک گیم کھیلاتے ہیں۔ یہ ملک شیک پہلے کون ختم کرے گا!''

ایک گلاس منّے کو تھماتے ہوئے بختاور نے چیلنج بھرے انداز میں کہا۔

''میں!'' بچی نے ایک سانس میں گلاس ختم کر دیا۔ بختاور مسکرائی اور پھر اُصول بن گیا۔ جو چیز مونا کھاتی وہی منّا کھاتا۔ جیسا کھلونا مونا کے پاس ویسا ہی منّے کے پاس ہوتا۔ ہفتوں میں ہی منّے کی صحت بدل گئی۔ صفیہ بیگم پہلے بھی منّے کا بھرپور خیال رکھتی تھی، مگر مونا جیسی خوراک وغیرہ نہیں دے سکتی تھی۔ منّا بہت خوش تھا۔ منّے کی تو پوری شخصیت ہی بدل گئی تھی۔ مونا کی دیکھا دیکھی منّا بھی اب اسے مما بولنے لگا تھا۔

پورے صحن میں گاڑی بھگاتا منّا کسی شہزادے سے کم نہیں لگتا۔

''آنٹی! آج آپ یہاں ہی رُک جائیں۔'' منّے کا ہاتھ پکڑے، بہت محبت سے مونا کہہ رہی تھی۔

''نہیں میری جان! ایسا ممکن نہیں ہے۔'' صفیہ نے پیار سے مونا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ مونا نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے ایک اور سوال کیا:

''آنٹی! اتنے گندے برتن دھو کر آپ تھکتی نہیں ہیں کیا؟''

''نہیں بیٹا!'' صفیہ بیگم نے مختصر سا جواب دیا۔

مونا لوگوں نے واپس جانا تھا۔ شہروز کو چاند رات کو جرمنی سے واپسی پر مونا اور بختاور کو ساتھ لے کر اسلام آباد جانا تھا۔ بختاور تیاریوں میں مصروف تھی۔ مونا اداس تھی۔

''مما! منّے کو ساتھ لے جائیں نا!؟''

''نو بیٹا! اور پھر وہاں آپ کے اور بہت سارے دوست بھی تو ہیں، جیسے ابیہہ، دعا۔''

''یس مما!'' ابیہہ، دعا کے نام پر مونا خوش ہوگئی۔ منّا افسردہ تھا۔ مونا کے جانے پر صفیہ اسے بہلا رہی تھی۔

آج عید تھی۔ صبح ہی صبح وہ منّے کے ساتھ حویلی میں چلی آئی تھی کام کے لیے۔ مونا کے جاتے ہی منّے کی حیثیت سامنے آ گئی تھی۔ وہ ایک نوکرانی کا بیٹا تھا، ان کے ٹکڑوں پر پلنے والا نوکر۔

''منّے! جا، یہ کچرا پھینکا آ، اور سن، یہ نخرے نہ کیا کر۔''

صفیہ کا دل پھٹنے لگا۔ اس کا لعل نوکر نہیں ہے، مگر وہ چپ رہی، کام کر کے واپس آ گئی۔

گھر میں مٹھائی لائی۔ حلوہ بنایا دیسی گھی میں منّے کے لیے، مگر منّے کو کچھ پسند نہیں آ رہا تھا۔ اس کی زبان نے تو طرح طرح کے ذائقے چکھ لیے تھے۔ حلوہ اور عام مٹھائی اسے کہاں پسند آنے والی تھی۔

ایک ماہ، پورا ایک ماہ اس نے طرح طرح کی چیزیں کھائی تھیں۔ نئی نئی چیزیں۔ بھلا! اب کہاں وہ باز آنے والا تھا۔ وہ تو آسائش کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ مالک بن کر گھومتا تھا، کہاں نوکر کا روپ اختیار کرتا۔ صفیہ نے اسے بہت ڈانٹا۔

مگر منّے کی ایک ہی ضد تھی، مونا والی مٹھائی۔ تنگ آ کر وہ ملک صاحب کے گھر گئی۔

''شکر ہے صفیہ! تم آ گئیں؟''

مٹھائی کے ڈبے ہاتھوں میں پکڑے شہر بانو کہہ رہی تھی۔ صفیہ کا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ وہ بہت خوددار تھی۔ مانگنا اسے نہیں آتا تھا۔ اللہ نے اس کی سن لی تھی۔

''صفیہ! سمیرا!'' شہر بانو نے ایک بار پھر ندا لگائی۔

''جی بی بی جی!''

''یہ مٹھائی کے ڈبے کچرے میں پھینک آؤ۔ فریج میں کافی سامان ہے۔ خود تو خیال نہیں آتا کہ صاف کر دیں۔''

سمیرا اور اُس نے ڈبے اٹھائے اور حویلی کے پاس بنے ڈھیر پر پھینک دیے۔

سمیرا واپس حویلی جا چکی تھی اور وہ ڈھیر پر بیٹھی رو رہی تھی۔

اچانک اس نے اردگرد دیکھا اور پھر ڈھیر سے مٹھائی کا ڈبا ڈھونڈنے لگی۔

ادیب صاحب

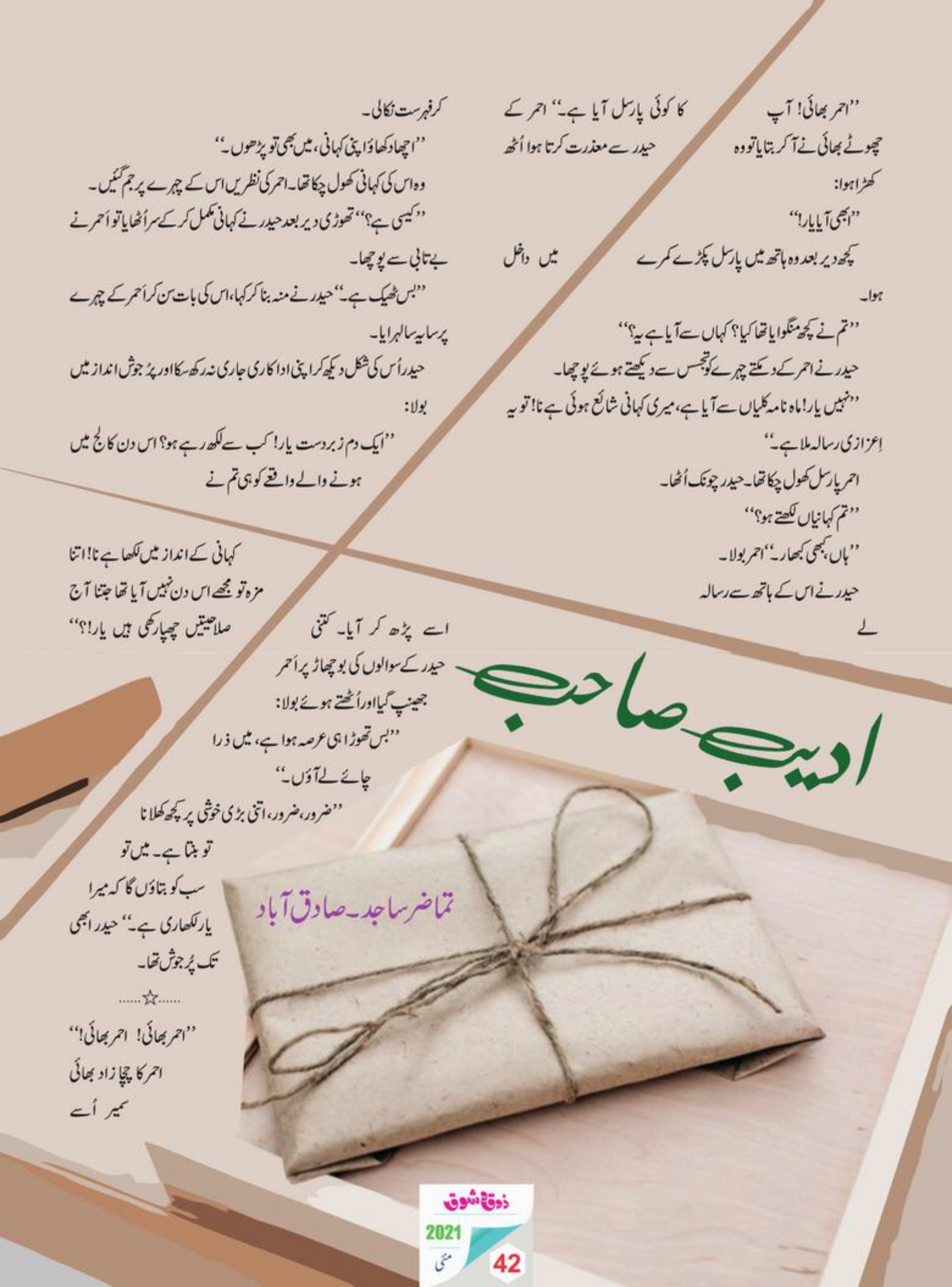

تماضر ساجد۔صادق آباد

''احمر بھائی! آپ کا کوئی پارسل آیا ہے۔'' احمر کے چھوٹے بھائی نے آکر بتایا تو وہ حیدر سے معذرت کرتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا:

''ابھی آیا یار!''

کچھ دیر بعد وہ ہاتھ میں پارسل پکڑے کمرے میں داخل ہوا۔

''تم نے کچھ منگوایا تھا کیا؟ کہاں سے آیا ہے یہ؟''

حیدر نے احمر کے دمکتے چہرے کو تجسس سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں یار! ماہ نامہ کلیاں سے آیا ہے، میری کہانی شائع ہوئی ہے نا! تو یہ اِعزازی رسالہ ملا ہے۔''

احمر پارسل کھول چکا تھا۔ حیدر چونک اُٹھا۔

''تم کہانیاں لکھتے ہو؟''

''ہاں، کبھی کبھار۔'' احمر بولا۔

حیدر نے اس کے ہاتھ سے رسالہ لے کر فہرست نکالی۔

''اچھا دکھاؤ اپنی کہانی، میں بھی تو پڑھوں۔''

وہ اس کی کہانی کھول چکا تھا۔ احمر کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔

''کیسی ہے؟'' تھوڑی دیر بعد حیدر نے کہانی مکمل کر کے سر اُٹھایا تو احمر نے بے تابی سے پوچھا۔

''بس ٹھیک ہے۔'' حیدر نے منہ بنا کر کہا، اس کی بات سن کر احمر کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔

حیدر اُس کی شکل دیکھ کر اپنی اداکاری جاری نہ رکھ سکا اور پُر جوش انداز میں بولا:

''ایک دم زبردست یار! کب سے لکھ رہے ہو؟ اس دن کالج میں ہونے والے واقعے کو ہی تم نے کہانی کے انداز میں لکھا ہے نا! اتنا مزہ تو مجھے اس دن نہیں آیا تھا جتنا آج اسے پڑھ کر آیا۔ کتنی صلاحیتیں چھپا رکھی ہیں یار!؟''

حیدر کے سوالوں کی بوچھاڑ پر احمر جھینپ گیا اور اُٹھتے ہوئے بولا:

''بس تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے، میں ذرا چائے لے آؤں۔''

''ضرور، ضرور، اتنی بڑی خوشی پر کچھ کھلانا تو بنتا ہے۔ میں تو سب کو بتاؤں گا کہ میرا یار لکھاری ہے۔'' حیدر ابھی تک پُر جوش تھا۔

.....☆.....

''احمر بھائی! احمر بھائی!''

احمر کا چچا زاد بھائی سمیر اُسے

آواز دیتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

''کیا بات ہے؟ کیوں چلا رہے ہو؟''

احمر نے اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

''وہ ناں احمر بھائی! آپ کو معلوم ہے ناں، کب سے ہماری چھٹیاں چل رہی ہیں، ابھی تک ختم ہی نہیں ہوئیں۔'' سمیر معصومیت سے بولا۔

''ہاں تو پھر؟'' احمر نے نہ سمجھنے والے انداز میں سوال کیا۔

''میں بور ہو رہا تھا نا تو امی کہنے لگیں کہ احمر کے گھر کافی رسالے آتے ہیں نا، کچھ لے آؤ پڑھنے کے لیے۔''

سمیر، احمر کے چہرے پر نظریں جمائے رک رک کر بولا۔

''اوہ ہاں، کافی رسالے اسی مہینے کے سامنے پلنگ پر رکھے ہوئے ہیں، جتنے لینے ہوں لے لو۔'' احمر کی بات سن کر سمیر تیزی سے پلنگ کی طرف لپکا۔

''اتنے ے ے سارے ے ے! یہ سب، یعنی کہ یہ سب اسی مہینے کے ہیں احمر بھائی!؟'' احمر، سمیر کی حیرت سے محظوظ ہوتا مسکراتے ہوئے بولا:

''ہاں بھئی، اب لے بھی لو۔'' سمیر نے تیزی سے چار پانچ رسالے اٹھائے اور کمرے سے نکل گیا۔

.....☆.....

کاغذ، قلم ہاتھ میں تھامے احمر کافی دیر سے کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب کچھ نہ لکھا گیا تو وہ جھنجھلا گیا:

''کیا مسئلہ ہے یار!؟'' وہ بڑبڑایا۔

''کیا ہوا، کس کو مسئلہ ہے؟'' کمرے میں جاتے ہوئے اسفر بھائی نے اس کی خود کلامی سنی تو وہیں رک گئے۔

''کچھ نہیں بھائی! بس ایک کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کافی دیر ہو گئی ہے، کچھ بھی نہیں لکھا جا رہا۔''

''ارے ادیب صاحب سے کچھ لکھا نہیں جا رہا، کمال ہے! اتنے تو آئیڈیاز بکھرے ہوئے ہیں ہمارے اردگرد، کچھ بھی لکھ لو۔''

''کچھ بھی ہی تو نہیں لکھا جا رہا۔'' احمر بے بسی سے بولا۔

''ہوں، تو یہ بات ہے۔'' اسفر بھائی کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

''احمر! تمھارے پاس کالج اور اکیڈمی کے بعد کچھ پڑھنے کا تو وقت ہی نہیں ہوتا، رسالے کس وقت پڑھتے ہو؟''

احمر، اسفر بھائی کی بات سن کر چونک گیا۔

''آپ کو تو پتا ہے، پہلے تو میں پڑھنے کا وقت نکال ہی لیتا تھا، لیکن اب جب سے میں نے خود لکھنا شروع کیا ہے تب سے گھر میں اتنے رسالے آتے ہیں، کچھ اعزازی، کچھ وہ جن میں میری کہانی ہو تو وہ میں خود خرید لیتا ہوں، اب سب تو نہیں پڑھے جا سکتے نا!''

''پہلے جو پڑھتے تھے وہ تو پڑھتے ہو گے؟''

''نہیں، اتنی کہانیاں دیکھ کر دل ہی نہیں کرتا۔'' احمر آہستگی سے بولا۔ ''ہاں، اپنی شایع ہوئی کہانی ضرور پڑھتا ہوں۔ اوہ!'' اسفر بھائی کو وضاحت دیتے ہوئے ایک خیال کے تحت وہ چونک گیا۔

''اوہ، شاید نئی کہانیاں نہ پڑھنے کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے، لیکن بھائی جان.....!'' وہ رُکا۔ ''اب تک میں سینکڑوں کتابیں پڑھ چکا ہوں۔ فیس بک وغیرہ پر بھی بہت کچھ پڑھتا رہتا ہوں۔''

''اپنا مسئلہ تو تم خود سمجھ گئے ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ علم ایک لامحدود سمندر ہے۔ انسان جتنا علم حاصل کرے کم ہے، مگر تم سمجھ رہے ہو کہ تم نے سارا علم حاصل کر لیا ہے اور یہی تمھاری سب سے بڑی بھول ہے۔ دیکھو، لکھنے والے کس لیے لکھتے ہیں؟ اسی لیے ناں کہ انھیں پڑھا جائے۔ نئی کہانیاں پڑھنے سے نہ صرف نئے خیالات آتے ہیں، بل کہ نئے نئے انداز میں لکھنا بھی آتا ہے۔ اچھا لکھاری بننے کے لیے اچھا قاری ہونا بہت ضروری ہے۔'' اسفر بھائی نے گویا پوری تقریر ہی جھاڑ دی۔ احمر سر جھکائے گم صم بیٹھا تھا۔

''کیا سمجھے ادیب صاحب!؟'' اسفر بھائی کی آواز پر اُس نے چونک کر سر اُٹھایا۔

''وہی، جو آپ مجھے سمجھانا چاہ رہے ہیں۔''

اسفر بھائی مسکرا دیے۔ احمر اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اَسفر بھائی نے اس کے کمرے میں جھانکا تو وہ اس ماہ کے رسالے اپنے سامنے ڈھیر کیے بیٹھا ان میں سے ایک رسالہ پڑھ رہا تھا۔ اسفر بھائی مسکراتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اگلی رات رات احمر کا قلم تیزی سے کاغذ پر چل رہا تھا۔ صفحے کی پیشانی پر لکھا عنوان ''ادیب صاحب'' جگمگا رہا تھا۔

مجرم کی تلاش

محمد عمر بن عبدالرشید۔ کراچی

اور پھر اَرحم نے انھیں پورا قصہ سنا دیا اور آخر میں بولا:

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہم نے تین آدمیوں کو اِس کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا جہاں سے سے ابھی آپ آئے ہیں، لیکن افسوس وہ تو اس گھر سے کب کے نکل چکے ہیں۔''

''ایک بات پر حیرت ہے سر! کہ آپ اس کمرے میں کس طرح پہنچ گئے؟''

''میں تو کالی جیل میں تھا کہ وہاں مجھے ایک تہ خانہ نظر آیا۔ میں تہ خانے میں اترا اور یہاں اس طرف نکل آیا۔ دراصل میں ان تین آدمیوں کی تلاش میں ہی اس طرف آیا ہوں۔ کیا تم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ تینوں آدمی چندر راؤ، کالی جیل کا سپرنٹنڈنٹ، انتظام غوری اور وہاں کا گارڈ، نواب تھے۔''

''کیا آ آ آ!'' تینوں چیخے۔

''لیکن اب ہم کس طرح پہنچیں گے ان تک، کیوں کہ وہ تو کسی چکنی مچھلی کی طرح ہمارے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔'' ارحم مایوسانہ انداز میں بولا۔ یہ سن کر اِنسپکٹر فراز مسکرائے اور پھر اَرحم کی طرف دیکھتے ہوئے بولے:

''مچھلی ہمارے ہاتھ سے نکل تو گئی ہے، لیکن وہ سمندر میں گرنے کے بجائے خشکی پر ہی گر گئی ہے۔''

''کیا مطلب!؟'' تینوں چونکے۔

''مطلب یہ کہ ہم ابھی بھی مچھلی کو جھپٹ کر پکڑ سکتے ہیں۔'' وہ مسکرائے۔

''لیکن کیسے!؟'' تینوں حیرت سے بولے۔

''ایسے۔'' یہ کہہ کر اِنسپکٹر فراز نے موبائل نکالا اور کسی کے نمبر ملانے لگے، جب کہ وہ تینوں حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ سلسلہ جیسے ہی ملا انسپکٹر فراز بولے:

''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! کیا آج کوئی بحری جہاز دہلستان جانے والا ہے؟''

''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! جی ہاں، ابھی ایک گھنٹے بعد جانے والا ہے۔'' آواز سنائی دی۔

''بھلا کیا نام ہے اس کا؟'' انسپکٹر فراز جوش میں آ کر بولے۔

''سی کنگ۔ کیا آپ کو اس کے لیے بکنگ کروانی ہے، لیکن اب اس جہاز میں جگہ نہیں ہے، دو دِن بعد ایک اور جہاز جائے گا۔ آپ کہیں تو اُس میں آپ کی بکنگ کروادوں؟'' دوسری طرف سے وہ آدمی کہتا چلا گیا۔

''نہیں، رہنے دیجیے۔'' یہ کہہ کر اِنسپکٹر فراز نے فون کاٹ دیا اور بولے:

''اب سمجھ گئے!''

''لیکن آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ وہ سمندری راستے سے جانے والے ہیں۔'' ارحم حیرت کے کے عالم میں بولا۔ ''ہوسکتا ہے کہ وہ سمندری راستے کے بجائے کسی اور ذریعے سے یہاں سے نکلیں۔''

''نہیں، وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں بھاگ سکتے، کیوں کہ اس طرح ان کے پاس دو راستوں کا انتخاب ہوگا۔ پہلا ہوائی جہاز، جس میں وہ بھول کر بھی سفر نہیں کر سکتے، کیوں کہ ائیر پورٹ پر بہت سخت چیکنگ

ہوتی ہے اور اِس طرح وہ آسانی سے پکڑے جاسکتے ہیں۔ دوسرا راستہ ان کے پاس بارڈر کے ذریعے جانا ہے، لیکن اس طرح بھی وہ پکڑے جاتے، کیوں کہ بارڈر تک جانے کے لیے یہاں سے کئی شہروں سے گزرنا پڑتا اور اِس طرح ہم ان کے بارڈر پر پہنچنے سے پہلے ہی انتظامات کروالیتے، پھر یا تو وہ راستے میں ہی پکڑے جاتے یا بارڈر پر، جب کہ دوسری طرف بحری جہاز کے ذریعے ان کے لیے بھاگ جانا نہایت آسان ہے، کیوں کہ بندرگاہ پر اِس قدر سخت انتظامات نہیں ہیں، اور ایک اہم بات یہ ہے کہ سی۔ کنگ ہمارے ملک کا جہاز نہیں ہے، بل کہ یہ جہاز دہلستان کا ہی جہاز ہے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ یہ بحری جہاز انھی لوگوں کے لیے آیا ہے۔

تم لوگ خود ہی سوچو کہ چند گھنٹے پہلے دہلستان کا ایک جاسوس چندر راؤ ہمارے ملک کی ایک اہم فائل P-225 لے اڑتا ہے اور اَب اس کے چند گھنٹوں بعد ہی ایک بحری جہاز جو دہلستان کا ہی ہے، وہیں جارہا ہے تو کیا یہ شک نہیں ہوتا کہ وہ انھیں کے لیے آیا ہوگا، اور اگر یہ سچ ہے تو پھر اُن لوگوں کے لیے جہاز پر چڑھنا کیا مشکل ہے، کیوں کہ جہاز کا عملہ ان کی مدد کر کے انھیں کسی بھی طرح جہاز پر سوار کر ہی لے گا۔''

اوہ! اوہ!'' تینوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

.....(جاری ہے).....

نوجوان اور محنت

محمد حذیفہ معاویہ تونسوی۔ ڈیرہ غازی خان

جس قوم کی تعمیر و ترقی کی راہ میں نوجوان ہراول دستہ ہو اُس قوم کی تاریخ کو بدلنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔

نوجوانی کی عمر عموماً لاابالی، گناہوں کی طرف میلان، من مانی، کھیل کود، دولت جمع کرنے کی لگن، عشق و محبت، محنت و جدوجہد، بلندیوں اور مستقبل کے بے بنیاد خوابوں کی عمر ہوتی ہے، جس میں عقل سے زیادہ جذبات کی بادشاہت ہوتی ہے۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی کئی نئی راہیں نوجوان کا استقبال کرتی ہیں، ان میں جہاں اچھی راہیں ہوتی ہیں وہاں بُری بھی پائی جاتی ہیں، جو خواہشات اور جذبات کے رنگین پردوں میں لپٹی ہوتی ہیں اور نوجوان کے دل و دماغ پر آسانی سے قابض ہو کر اپنا کنٹرول سنبھال لیتی ہیں۔

گویا اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ نوجوان خواہشات کے ایسے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے جس کی لگام کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ اس نوجوان کو اپنی مرضی سے جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے۔

نوجوان کی اس پستی کی بڑی وجہ مقصدِ حیات سے لاعلمی ہے۔ بعض نوجوان تو مقصد کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اگر اُن سے پوچھا جائے کہ آپ کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ تو پہلے تو ایسے دیکھتے ہیں جیسے کسی ایسی چیز کے بارے میں پوچھ لیا ہو جس کا وجود اِس جہاں میں نہ ہو، پھر فوراً سوال کرتے ہیں کہ ''کیا زندگی کا بھی کوئی مقصد ہوتا ہے؟''

بعض جو کسی حد تک زندگی کے مقصد کو مانتے ہیں ان کے ہاں مقصد کی تعریف پیشہ، مقام اور سرمائے تک محدود ہے۔ اس کے آگے وہ کسی مقصد کو نہیں جانتے۔

اس کی بڑی وجہ قرآن مقدس اور سنت نبوی ﷺ سے غیر معمولی حد تک دوری ہے، کیوں کہ قرآن میں واضح اعلان ہے، جس کا مفہوم یہ ہے:

''ہم نے جنوں اور اِنسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔''

اس بات سے انکار نہیں کہ پیشہ، سرمایہ اور اعلیٰ مقام و مرتبہ انسان کی ضرورت ہے، لیکن ضرورت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑنا، زندگی کی بازی تک لگا دینا، جب کہ مقصدِ حیات کو مقصد تو دور کی بات، قابلِ عمل ہی نہ سمجھنا، یہ ایک ایسی بات ہے جسے شریعت کے ساتھ ساتھ سلیم الفطرت انسان کی عقل بھی تسلیم نہیں کر سکتی۔

پستی کی وجوہات میں سے ایک وجہ محنت سے جی چرانا اور بے جا سستی ہے۔ اگر ہم حکما کے اقوال کی روشنی میں دیکھیں تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کام یابی کے لیے ذہانت نہیں، بل کہ محنت شرط ہے۔ اگر دس فی صد میں سے ۲ فی صد کام یابی کا دارومدار ذہانت پر ہے تو باقی ۸ فی صد کا محنت پر ہے۔

نوجوانوں کی راہ میں ایک رکاوٹ یہ دعویٰ بھی ہے:

''میں وقت آنے پر یہ کام کرلوں گا۔''

تو یاد رکھیں، وہ وقت کبھی نہیں آتا۔

بعض نوجوان حالات کی مشکلات سے گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتے۔ ایسے نوجوانوں کو سمجھنا چاہیے کہ راہِ حق کی مشکلات ہی کام یابی کی دلیل ہوتی ہیں، کیوں کہ لوگ پتھر اُسی درخت کو مارتے ہیں جس پر پھل زیادہ ہوتا ہے اور جب تند و تیز ہوائیں چلتی ہیں تو سب سے زیادہ ان عمارتوں سے ہی ٹکراتی ہیں جو سب سے بلند اور اُونچی ہوتی ہیں۔

تاریخ سے ناواقفیت بھی آج کے نوجوانوں کی پستی اور ذِلت کے اسباب میں سے ایک ہے، کیوں کہ جو قوم اپنے ماضی کو بھلا دے اس

قوم کے مستقبل کو ذلت اور گمراہی کے اندھیروں سے بچانا تقریباً ناممکن ہے۔ جس قوم کو اپنے اسلاف کے کارناموں کا علم نہ ہو وہ ان پر عمل کیا کرے گی؟ اگر اَب بھی نوجوان ماضی کے دریچوں میں جھانکیں تو قوم کو نئی زندگی مل سکتی ہے۔

تاریخ اسلامی کی ابتدا سے نوجوان میدانِ عمل میں اترتے چلے آئے ہیں۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے جوانی ہی میں عظیم الشان لشکر کی کمان سنبھالی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دورِ نبوت سے جوانی میں ہی سیف اللہ کا لقب پایا۔ حضرت علی، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عمار بن یاسر، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت ابن زبیر، حضرت ابن عاص رضی اللہ عنہم، یہ وہ عظیم صحابہ ہیں جو جوانی میں دین اسلام کی خاطر برسرِ پیکار رہے اور دینِ اسلام کی سربلندی کے لیے ہر میدان میں صف اول پر نظر آتے تھے۔

اسی جوانی میں ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہم جیسے مجدد، علوم کی گہرائیوں میں اترے اور پورے عالم میں اسلام کے چرچے بلند کیے۔

جوانی میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے کفر کی جڑیں اکھاڑ کر بیت المقدس کو آزاد کروایا۔ جوانی میں ہی طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم جیسے جرنیل ہزاروں سسکتی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے میدان جہاد میں اترے اور کفار کو نیست و نابود کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔

یہ سینکڑوں واقعات ہمیں دعوت فکر دیتے ہیں کہ اے نوجوان مسلمانو! تم کہاں کھو گئے ہو۔ آج امت مسلمہ تڑپ رہی ہے۔ ظلم کی چکی میں پستی مائیں اور بہنیں کسی طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم کی منتظر ہیں، جو انھیں اس ظلم کی خوف ناک وادیوں سے نکال کر امن کے قلعوں میں پناہ دیں۔

اگر تم نے آج بھی اپنے مقصد، مقام اور مرتبے کو نہ پہنچانا تو کبھی نہیں پہچان پاؤ گے۔

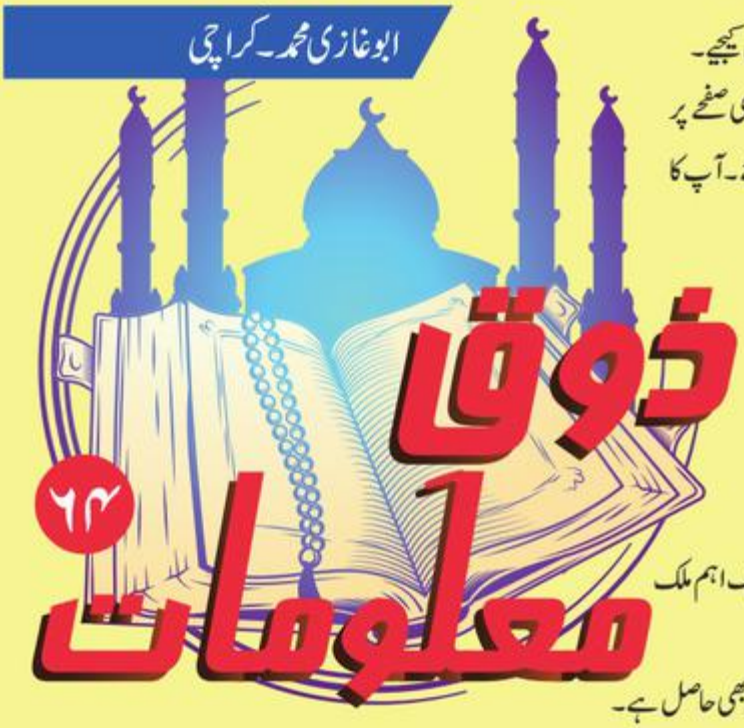

ابوغازی محمد۔ کراچی

یہ کُل پانچ اشارات ہیں۔ آپ ان کی مدد سے درست جواب تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔

اگر آپ ان اشارات کے ذریعے جواب تک پہنچ جائیں تو بُوجھا گیا جواب آخری صفحے پر موجود کوپن کے ساتھ ہمیں ارسال کر دیجیے اور اپنی معلومات کا انعام ہم سے پائیے۔ آپ کا جواب ۳۱ مئی تک ہمیں پہنچ جانا چاہیے۔

یہ کیا ہے؟

1. یہ ملک 16 دسمبر 1991ء کو روس کے تسلط سے آزاد ہوا۔ یہ وسط ایشیا کا ایک اہم ملک ہے۔ اس کا رقبہ 2,717,300 مربع کلومیٹر ہے۔
2. اس ملک کو رقبے کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔
3. اس ملک میں شرح خواندگی کا تناسب 97 فی صد ہے، جس میں سے میں مسلمانوں کا تناسب 47 فی صد ہے۔
4. لوہا، کوئلہ، کرومائٹ، سیسہ اور زنک کے ذخائر سے مالا مال یہ ملک زرعی اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔
5. دنیا کا بارھواں بڑا صحرا ''کزل کم'' اس ملک سے ہو کر گزرتا ہے۔

شوق
ذوق و
حذیفہ اقبال
عمر ۱۰

عائشہ فیصل
ابتدا اسکول
کراچی.
اور تم اپنے رب کی کون
سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

زینب فہیم
الخلیل اسکول
کراچی
جماعت ششم

فاطمہ بنتِ منظور احمد
جامعہ بنات مفصر رضی اللہ عنہا
کراچی -

ذوقِ
مصوری

اسکول فوبیا

پیارے بچو! کہیں آپ کے گھر والوں کو بھی تو فیضی کے گھر والوں کی طرح آپ کی اسکول/ مدرسے کی پڑھائی کرانے کے لیے ایسے ہی پاپڑ تو نہیں بیلنے پڑتے؟ پڑھیے فیضی کی روداد۔

ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی۔ کراچی

فیضی صاحب آٹھویں جماعت میں کچھ دن پہلے آ تو گئے ہیں، مگر اَب تک انھیں اسکول فوبیا کی بیماری چمٹی ہوئی ہے۔ وہ بچوں کے اس بڑے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کا خیال ہے کہ سب اسکول جہنم میں ہوں گے۔

فیضی صاحب کو تو اپنی دعا کی تاثیر ختم ہو جانے کا بھی بڑا صدمہ ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ ان کا ایمان بہت کمزور ہو چکا ہے، شاید اسی لیے ہمیشہ ماہانہ ٹیسٹ اپنے وقت پر ہو جاتے ہیں، مجال ہے جو کبھی ملتوی ہوئے ہوں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ٹیسٹ اور امتحان جیسی فضول رسموں کو اَب ختم ہو جانا چاہیے، مگر پچاس فی صد طالب علموں کے علاوہ ان کا ہم نوا کوئی نہیں ہے۔

ایک دن امی جان نے بے زار ہو کر اَبا جان سے کہا:

''ہفتے میں پانچ دن تو اِسکول جانا ہوتا ہے، اس میں بھی فیضی تیسرے یا چوتھے دن بیمار ہو جاتا ہے۔ مزاحیہ بہانوں سے اب ہم عاجز آ چکے ہیں۔ آئے دن فیضی کو کوئی نہ کوئی نئی بیماری آ پکڑتی ہے۔''

پندرہ دن پہلے کی بات ہے کہ نمازِ فجر کے فوراً بعد فیضی کی ٹانگوں میں ایسا شدید درد اُٹھا کہ اس کی چیخیں بر آمد ہونے لگیں، مگر اُس کے بھائی صاحب بھی ایسے اہلِ نظر ہیں کہ ایک نظر میں ہی اصل حقیقت بھانپ لی۔ ہوا یہ کہ اپنی ہی ایک تیز کراری چیخ پر فیضی کی اچانک ہنسی چھوٹ گئی، حالاں کہ فیضی نے فوراً ہی منہ موڑ کر بمشکل ہنسی ضبط کر لی تھی، مگر بھائی صاحب کو شک گزر گیا۔ اگرچہ وہ اس ہنسی کے چشم دید گواہ نہ تھے، مگر فیضی کے جبڑوں کی حرکت انھیں ایک جانب سے نظر آ گئی اور خاصی مشکوک معلوم ہوئی۔ تب انھوں نے فیصلہ کیا کہ فیضی کا علاج کرنا چاہیے۔

''فیضی! ایسا کرو، آج تم اسکول نہ جاؤ۔ چھٹی کر کے ٹانگوں کو آرام دو۔''

بھائی صاحب کا یہ کہنا تھا کہ فیضی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اللہ کا شکر ہے، ریاضی کے ٹیسٹ سے نجات ملی۔

''یہ درد تو خاصا خطرناک، بل کہ مہلک معلوم ہوتا ہے؟ ایسا کرو کہ چھٹیاں لے کر مکمل آرام کرو۔''

بھائی صاحب نے جل کر کہا اور فیضی کی مظلوم شکل پر فکر کی لکیریں ابھر آئیں۔

''مگر بھائی جان! ابا جان کبھی نہیں مانیں گے۔ اتنی لمبی چھٹی وہ مجھے کا ہے کو

دِلوانے لگے؟'' فیضی نے مایوسی سے کہا۔

فیضی کا بھرپور ردِعمل دیکھ کر بھائی صاحب نے بڑی چالاکی سے ابا جان کو رپورٹ پیش کی۔ ابا جان نے آرڈر دیا:

''چوں کہ فیضی کی ٹانگوں میں بہت درد ہے، لیکن چھٹی تو نہیں کرائی جاسکتی اور چلنے سے پرہیز بھی ضروری ہے، لہٰذا آج جمیل بابا، فیضی کو اپنی کمر پر ڈال کر اِسکول چھوڑ کر آئے گا۔''

جمیل گھر کا پرانا اور بڑا ہی ہٹا کٹا، تن درست ملازم ہے۔

ابا جان کی بات سن کر فیضی گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''ابا جان! پانچ منٹ کا تو راستہ ہے۔ آہستہ آہستہ چل کر پہنچ جاؤں گا۔''

فیضی نے جمیل کو قریب پا کر وحشت زدہ لہجے میں کہا۔

''نہیں، تم تکلیف میں ہو۔ میں اپنے بچے کا خیال نہ کروں کیا!؟''

ابا جان نے پیار سے کہا۔

''نہیں ابا جان! آپ مجھے درد کی گولی دے دیں، میں کھا کر اِسکول چلا جاؤں گا۔''

فیضی نے گھبرا کر بستہ ہاتھ میں اٹھایا اور جوتے کے تسمے باندھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''نہیں چھوٹے صاحب! ہم کس لیے ہیں آپ کے خادم؟''

جمیل نے اپنی بتیسی نکالی اور فیضی کو بستہ اٹھائے تیار دیکھ کر پہلوان کی طرح کمر سے پکڑا، پھر اُچھال کر کمر پر چڑھا لیا۔ وہ بستہ بھی جمیل نے اپنے بازو پر لٹکا لیا۔

''مم..... میں واپس کیسے آؤں گا تم چھوڑ کر آجاؤ گے مجھے تو؟''

فیضی نے چیخ کر جمیل سے کہا۔

''ہمت کر لیجیے گا چھوٹے صاحب! نہیں تو ٹانگیں وہیں چھوڑ آیئے گا، میں بعد میں جا کر لے آؤں گا۔ ہی ہی ہی!''

جمیل نے ہنستے ہوئے ایسا دل خراش حل بتایا کہ اسے سُن کر ہی فیضی کو خوف محسوس ہونے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ جمیل کی گردن پر ایک مکا رسید کر دے، مگر وہ ایسا بھی نہ کر سکتا تھا۔ بڑوں کی بے ادبی کے علاوہ ابا جان اسے انسان حقوق کی خلاف ورزی قرار دے کر اُس کے خلاف کوئی اور بڑا مقدمہ قائم کر سکتے تھے۔

یہی سوچتے سوچتے اسے سامنے اسکول کا گیٹ نظر آ گیا۔

''نیچے اتارو مجھے۔''

فیضی نے قدرے نرم لہجے میں، مگر حکم دینے کے انداز میں کہا۔

''چھوٹے صاحب! مجبوری ہے۔ بڑے صاحب نے کہا ہے کہ اسکول کے اندر تک چھوڑنا ہے۔'' وہ بولا۔

''ارے..... بب..... بچے..... مذ..... اق..... اڑائیں گے میرا۔''

فیضی نے گھبرا کر کہا، مگر جمیل کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور وہ کسی مست ہاتھی کی طرح اسکول کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ چوکی دار فیضی کو دیکھ کر مسکرایا۔ کچھ بچے بھی ہنس رہے تھے۔

''واہ! کیا زبردست سواری ہے فیضی کی!''

دسویں جماعت کے ایک بچے نے ہانک لگائی۔

''تمھارے پیر میں چوٹ آئی ہے یا دماغ میں..... ہی ہی؟''

اس کی کلاس کے مانیٹر نے پوچھا۔ کسی نے کہا:

''یار! چلنا بھول گئے ہو کیا!؟'' اور کسی نے کہا:

''کافی دن بعد گھڑ سواری کی ہے کیا؟ وہ بھی ساحل سمندر پر نہیں، بل کہ صحن اسکول پر، ہاہاہا!''

فیضی کا خوب مذاق بنا اور اِس طرح ٹانگوں کے درد والے بہانے سے گھر والوں کو ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی، تاہم ابھی فیضی کی اصلاح نہ ہو سکی تھی۔ نجانے ابھی گھر والوں کے کتنے امتحان اور باقی تھے!

اگلے ہفتے فیضی نے دونوں بازوؤں میں درد کا بہانہ کیا۔ اسے اطمینان تھا کہ اسکول اگر جانا ہی پڑا تو جمیل اسے نہیں، صرف اس کے بستے کو ہی اٹھا سکے گا، کیوں کہ ٹانگیں ایک دم چوکس اور صحت مند ہیں، مگر جمیل نے اس دن فیضی کے بازوؤں کی ایسی سخت مالش کی کہ اس کی چیخیں ہی نکل گئیں۔ بعد میں اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر یہ یقین کرنے کی کوشش کی کہ ہڈیاں سلامت بھی ہیں یا جمیل کے لوہے جیسے ہاتھوں میں کچلی جا چکی ہیں؟ جب وہ ہاتھوں کو ہلانے میں کام یاب ہو گیا تو اُس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

''چھوٹے صاحب! درد ٹھیک ہو گیا ہے تو اِسکول چلتے ہیں یا ابھی دوبارہ مالش کر دوں؟''

جمیل نے بہت معصومیت اور سادگی سے پوچھا۔

''نن..... نہیں، میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔ بستہ بھی میں خود پکڑ لوں گا، تم رہنے دو۔'' فیضی نے ہتھیار ڈال دیے۔

یہ تیسرا ہفتہ تھا۔ فیضی نے رات سے ہی سوچ لیا تھا کہ پیٹ میں سخت درد کا بہانہ ٹھیک رہے گا۔ جمیل نہ مجھے پیٹ کے بل اٹھا کر لے جا سکتا

ہے، نہ پیٹ کی سخت مالش کرسکتا ہے اور نہ ہی پیٹ میں ہڈیاں ہیں کہ ٹوٹ جائیں گی! ہونہہ..... جی تو چاہتا ہے کہ اس جمیل کو کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دوں۔ شکل سے ہی جلاّد لگتا ہے۔ فیضی نے دل میں سوچا اور پھر سکون سے چادر اُوڑھ کر سو گیا۔

فجر کی نماز کے بعد فیضی ابا اور بھائیوں کے ساتھ گھر واپس آیا تو اُس نے رونی صورت بنالی اور بستر میں لیٹ گیا۔

''بیٹے فیضی! کیا ہوا؟ کیوں رو رہے ہو؟''

امی نے پیار سے پوچھا۔

''وہ..... امی!..... پیٹ میں..... پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے۔''

فیضی نے اذیت ناک شکل بنائی تو امی کو بہت رحم آیا۔

''بیٹے! میں نے تو گوشت کا بالکل سادہ سالن پکایا تھا۔ نجانے میرے بچے کو اِتنی تکلیف کیسے ہوگئی؟'' امی کو تشویش ہونے لگی۔

''امی! آپ بلاوجہ پریشان ہو رہی ہیں! یہ تو فیضی صاحب ہیں لکڑ ہضم، پتھر ہضم، انھیں کیا ہوگا!؟'' باجی نے مسکرا کر کہا۔

''امی! فیضی صاحب اس قول پر عمل کرتے ہیں کہ کھانے کے لیے جیو۔ کھاؤ، خوب کھاؤ، کھاتے ہی چلے جاؤ، پھر خوب کھاؤ اور جب پیٹ لبالب بھر جائے تو اِتنا ہی اور کھاؤ۔ ہاہاہا!'' آپی ہنسنے لگیں۔

''جی، پھر یہ حشر تو ہونا ہی ہے نا!''

بھائی جان کمرے میں اپنی کتاب اٹھانے آئے تھے، جب کہ بھائی صاحب کو فیضی سے چھیڑ چھاڑ کیے بغیر دنیا ہی ویران لگتی ہے۔

''مگر یہ راز آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کھائے بکری کی طرح اور سوکھے لکڑی کی طرح۔ اتنا میں کھاؤں تو فٹ بال بن جاؤں۔''

بھائی صاحب نے قہقہہ لگایا۔

''بل کہ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ فیضی، بسم اللہ ہی نہیں پڑھتا۔ جبھی تو اِتنی بڑی دیگچی خالی ہوجاتی ہے اور پیٹ میں درد ہوجاتا ہے۔ ہی ہی ہی! بل کہ مجھے تو لگتا ہے کہ بسم اللہ نہ پڑھنے کی وجہ سے کئی شیطان بھی فیضی کے پیٹ سے ہی کھانے کا ایزی لوڈ لیتے ہوں گے۔ ہاہاہا!''

آپی نے شرارت کی انتہا کردی۔

یہ سب اعلیٰ پائے کے ڈائیلاگ سن کر تو فیضی کی سچ مچ ہی طبیعت خراب ہونے لگی، مگر پیٹ کی نہیں، بل کہ دل کی اور دکھ آنکھوں کے راستے آنسو بن کر بہہ نکلا۔ اسے اپنے چاروں بھائی بہنوں سے یہ امید بالکل نہیں تھی۔

آخر کار اُس کے دل کی بات امی نے ہی کہہ دی:

''تم لوگ بھائی بہن ہو یا دشمن؟ سب سے چھوٹا بچہ ہے میرا، جاؤ عریشہ! تم جا کر سونف الائچی کا پانی پکالاؤ۔ اسے پی کر ذرا طبیعت بحال ہوجائے گی۔''

''معافی چاہتا ہوں امی! مگر طے شدہ بات ہے کہ اب ان کی طبیعت آٹھ بج کر پندرہ منٹ سے پہلے ہرگز ٹھیک نہیں ہوگی۔''

بھائی صاحب نے کہا۔

سونف الائچی کے پانی سے فیضی کو ذرا بھی آرام نہ آیا، مگر بھوک اور کھل کر لگنے لگی۔ یوں بھی یہ درد شکم تو تھا نہیں، اسکول فوبیا والا درد تھا۔

''امی! مجھے ناشتا کب دیں گی؟''

فیضی نے کافی احتیاط، یعنی آہستگی سے پوچھا۔

''ناشتا! نہیں بیٹے! اس سے درد اور بڑھ جائے گا۔'' امی نے نرمی سے کہا۔

''یعنی آپ مجھے بھوکا رکھیں گی؟''

فیضی نے گھبرا کر کہا۔

''ہاں، فی الحال۔'' امی نے جواب دیا۔

''مگر امی! میرے پیٹ میں تو چوہے دوڑ رہے ہیں۔''

فیضی کا احتجاج اب بلند ہو چکا تھا۔ آپی جو اِسکول جانے کی تیاری میں مصروف تھیں، جل کر اُس کے پاس آ کھڑی ہوئیں:

''بہتر ہے کہ تم چوہے مار دوا کھالو، سب چوہے مر جائیں گے۔''

''اور میں بچ جاؤں گا کیا!؟''

فیضی نے تعجب سے کہا۔

''ظاہر ہے، چوہے چھوٹے ہوتے ہیں، اتنے جان دار اور طاقت وَر کب ہوتے ہیں؟''

آپی نے بھڑاس نکالی۔

''اور اتنے لحیم شحیم بھی۔''

بھائی صاحب اندر آتے ہوئے بولے، جو فیضی کی طبیعت پوچھنے آئے تھے۔

''لحیم شحیم کیا ہوتا ہے؟''

فیضی نے معصومیت سے پوچھا۔

''لمبا چوڑا، موٹا تازہ، تن درست، خوب ستانے والا اور.....''

بھائی صاحب نے گھور کر کہا۔

''تم لغوی معنی بتا رہے ہو یا دل کی بھڑاس نکال رہے ہو؟''

امی نے فیضی کی حمایت میں بھائی صاحب سے سخت لہجے میں کہا تو بھائی صاحب شرمندہ ہو گئے۔

''موصوف کھانے کو مانگ رہے ہیں۔''

آپی نے فیضی کا پول کھول دیا۔ بھائی صاحب کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ہائیں! مطلب یہ ہے کہ تم ٹھیک ہو گئے ہو؟ تمھیں بھوک بھی لگ رہی ہے؟ چلو، میں تمھیں اسکول لے چلو، سائیکل پر لے جاؤں گا اور اگر سائیکل پر نہ بیٹھ پاؤ تو جمیل کی کمر پر.....''

بھائی صاحب نے نہایت بدمعاش قسم کی شاطرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''نن.....نہیں! میں کمر پر چڑھ کر اسکول نہیں جا سکتا۔ بچے میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ ویسے بھی میں تو بیمار ہوں۔ امی! آپ مجھے کوئی ہلکی غذا دے دیں۔''

فیضی نے گھبرا کر کہا۔

''مثلاً وہ کیا ہو؟''

بھائی صاحب نے تیز دھار آلے جیسی آواز نکالی۔

''آ.....پ.....امی ہیں کیا؟''

فیضی نے احتجاج کیا۔

''کیا کھاؤ گے بیٹے!؟''

امی نے پیار سے کہا۔

''آپ کسٹرڈ، کھیر بنالیں اور کھچڑی یا دلیے کے ساتھ رات کا گوشت والا سالن ہی دے دیں۔ وہ نہیں ہو تو دو انڈے اُبال دیں، ہلکی پھلکی ڈبل روٹی کے ساتھ ہی کھالوں گا۔''

فیضی نے معصومیت سے کہا۔ آپی اور بھائی صاحب نے ہنسنا شروع کر دیا۔

''بیٹے! دوپہر کو کھچڑی، پتلی کھچڑی پودینے کی چٹنی کے ساتھ مل جائے گی۔ ابھی تو صرف سونف الائچی کا پانی مل سکتا ہے۔ ابا جان کا حکم ہے کہ ڈھائی بجے تمھیں کچھ کھلایا جا سکتا ہے، اس سے پہلے نہیں۔''

امی نے قدرے اداسی سے فیضی کو مطلع کیا۔

''کک.....کیا؟ مم.....میں اسکول ہی چلا جاتا ہوں۔''

فیضی نے گھبرا کر کہا۔

''نہیں میرے بچے! ابھی مطب کھل جائے گا تو ڈاکٹر کو دِکھا لاؤں گی۔ ابھی تم آرام کرو۔''

''ڈاکٹر کو کیوں دکھائیں گی؟ درد تو فیضی کو ہے؟ ہی ہی ہی!''

بھائی صاحب نے تو امی سے بھی شرارت کر لی! امی نے انھیں ایک ہاتھ رسید کیا۔

''امی! وہ کیا کرے گا میرے ساتھ؟''

فیضی نے سہم کر پوچھا۔

''انجکشن لگائے گا!'' بھائی صاحب نے مزے لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں، مجھے نہیں جانا!''

فیضی چیخا۔ اس کی آواز سن کر بھائی جان اندر چلے آئے۔

ابا جان کے کمرے میں اتنی طاقت وَر آوازیں آ رہی ہیں کہ ابا جان نے اخبار چھوڑ کر مجھ سے کہا ہے کہ میں دیکھ کر آؤں، شاید مریض خود بخود ہی ٹھیک ہو گیا ہے۔ اچھا تم مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ تمھیں کیا ہو رہا ہے؟''

بھائی جان نے اپنی ہنسی دباتے ہوئے کہا۔

''مم.....مجھے بس ذرا سا درد ہو رہا ہے!''

فیضی نے جلدی سے کہا۔

''ذرا سا درد.....وہ کہاں ہو رہا ہے؟''

بھائی جان نے پوچھا۔

''آپ کو کیوں بتاؤں؟ آپ ڈاکٹر ہیں کیا؟''

''ہوں نہیں تو بن جاؤں گا! سیکنڈ ائیر میں تو ہوں، اب میڈیکل میں داخلہ بھی ہو گا ان شاء اللہ! اس لیے پریکٹس ابھی سے کر رہا ہوں بچے!''

بھائی جان بڑے معالجانہ انداز سے بولے۔

''ہونہہ! آپ کیس دیکھ لیں گے تو پھر ڈاکٹر کیا کرے گا؟''

فیضی جل کر بولا۔

''وہ میری رپورٹ پر یقین کر کے انجکشن تجویز کرے گا اور لگوا دے گا۔ ہاہاہا!'' بھائی جان نے قہقہہ لگایا۔

بھائی جان کا قہقہہ فیضی کو کافی بُرا لگا، اس کا جی چاہا کہ کاش وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوتا، دن رات نازوں میں پالا جاتا اور اِسکول نہ جانا چاہتا تو پول کھولنے والا کوئی نہ ہوتا، ہونہہ بھائی جان نہ ہوئے دشمن ہو گئے! وہ سوچتے سوچتے بڑبڑانے لگا۔

''نہیں بیٹے! ایسے نہیں کہتے؟'' امی نے پیار سے کہا۔

''اگر تم تفصیل بتا دو تو میں ڈاکٹر کے پاس تمھیں خود ہی لے جاؤں گا!''

بھائی جان نے نرم لہجے میں کہا۔

''کیسے؟ کمر پر؟''

وہ خوف زدہ ہوگیا۔ سب ہنسنے لگے۔

''نہیں بابا! سائیکل پر، امی کو جانا نہ پڑے گا! ہاں بولو؟ کہاں درد ہے؟''

بھائی جان نے کہا، وہ تو اُس کی جان کو ہی چمٹ گئے تھے۔

''مم..... میں ابھی آتا ہوں روم نمبر تھری سے!؟''

فیضی نے گھبرا کر واش روم کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا تم نہانا چاہتے ہو؟ نہانے سے پیٹ کا درد بھی ٹھیک ہوتا ہے؟''

بھائی جان نے پوچھا۔

''واش روم!''

وہ جل کر بولا۔ سب سے جان بچا کر وہ باتھ روم میں آکر سوچنے لگا کہ اب کون سی ترکیب لڑاؤں؟ بُری طرح پھنس گیا ہوں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ڈھائی بجے تک کیسے بھوکا رہ سکے گا؟ اب جھوٹ نے اسے ایسا پھنسایا تھا کہ اگرچہ اسے اسکول جانا ہی اب زیادہ آسان لگ رہا تھا، مگر وہ کیسے خود اپنے منہ سے کہے؟ یہ ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

جب وہ باہر آیا تو بھائی جان ابھی تک وہیں موجود تھے۔ انھیں دیکھ کر فیضی چڑ سا گیا۔

''بھائی جان! آج آپ اسکول نہیں جائیں گے کیا؟''

فیضی نے چلا کر کہا۔

''نہیں۔'' بھائی جان مزے سے بولے۔

''کیوں؟ کیا آپ کے پیٹ میں بھی درد ہے؟''

فیضی نے تعجب سے پوچھا۔

''نہیں تو! میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔''

بھائی جان مسکرائے۔

''پھر کیا..... آپ..... نہ جانے کے بہانے بنا رہے ہیں؟''

فیضی کو اور حیرت ہوئی۔

''نہیں، یہ میرا کام نہیں ہے! میں بڑا ہوگیا ہوں، اسکول نہیں جاتا، کالج جاؤں گا ضرور، مگر آدھے گھنٹے بعد، اور جب تک میں یہاں ہوں، تمھارا خیال رکھوں گا۔ ہاں تو کہاں درد ہے تمھارے؟''

بھائی جان مسکرا رہے تھے۔

''اب درد نہیں ہے بھائی جان! تکلیف ختم ہوگئی ہے۔''

فیضی نے گھڑی دیکھ کر اطمینان سے کہا، کیوں کہ اسکول کی اسمبلی شروع ہونے میں فقط پندرہ منٹ باقی تھے۔ بیس منٹ تو فیضی کو صرف تیاری میں لگتے تھے، اس لیے اب چھٹی یقینی تھی۔

''درد نہیں ہے بھئی!''

بھائی جان نے خوشی سے نعرہ لگایا۔

''ہاں، اب نہیں ہے درد بھائی جان! اور امی! ناشتا دے دیں، بہت بھوک لگ رہی ہے مجھے!'' فیضی نے امی سے خوشامد کے انداز میں کہا۔

''ہاں بیٹے! مگر اُس کے لیے تو ابا جان سے اجازت لینی ہوگی؟''

امی نے بے بسی سے کہا۔

''اور مجھے افسوس یہ ہے کہ اتنا لذیذ تازہ کیک، جو میں ابھی لایا ہوں، فیضی کے بغیر ہم لوگوں کو کھانا پڑے گا! اگر فیضی صحیح حالت میں ہوتا تو میں پورا کیک فیضی کو ہی دے دیتا۔'' بھائی جان بولے۔

''اچھے بھائی جان! میں تو اَب بالکل ٹھیک ہوگیا ہوں!''

فیضی نے خوشی سے کہا، اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ بھائی جان نے کیک سامنے رکھتے ہوئے کہا:

''مگر اِسے کھانے کی شرط یہ ہے کہ جو اِسکول جائے گا وہ کھا سکتا ہے، اس طرح کیک تمھاری آپی اور بھائی صاحب کو مل سکتا ہے۔''

بھائی جان بڑے ہی شاطر لہجے میں بولے۔

مم..... میں..... اسکول ضرور چلا جاتا، مگر اَب وقت نہیں ہے! دیر سے جاؤں گا تو بہت سزا ملے گی۔''

فیضی نے اطمینان سے کہا۔

''پھر ایسا کرو فیضی! کہ پانچ منٹ کا کمال تم دکھاؤ اور پانچ منٹ کا کمال مجھے دکھانا پڑے گا۔ وہ ایسے کہ تم منہ دھو چکے ہو، کیک کھاؤ اور میں تمھیں اپنی ''ہیلی کاپٹر سائیکل'' پر بٹھا کر اِن شاء اللہ! صرف تین منٹ میں پہنچا دوں گا۔''

بھائی جان نے ''آفر'' دی۔ فیضی کا بھوک سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ تین منٹ میں وہ آدھا کیک چٹ کر گیا اور آدھا دوپہر کے لیے محفوظ کرالیا، پھر بیس منٹ والی تیاری نہایت پھرتی سے پانچ منٹ میں کی اور حیرت انگیز طور پر فیضی صاحب صرف تین منٹ لیٹ اسکول پہنچ گئے۔ اسمبلی کے لیے قطاریں لگ چکی تھیں۔ فیضی نے بستہ کلاس میں رکھا اور دوڑ لگا دی۔

گھر میں سب لوگ قہقہے لگا رہے تھے، حالاں کہ فیضی نے صبح ہی صبح سب گھر والوں کو خوب ''ڈرل'' کرادی تھی۔

بھائی جان کو اُمید تھی کہ اتنی دفعہ کی بے عزتی کے بعد فیضی کا ''شوقِ چھٹی'' سرد پڑ گیا ہوگا، مگر اَگلے ہفتے پھر اُسی مشکل سے سابقہ پڑ چکا تھا!

پیر، منگل اور بدھ کو اِسکول جا جا کر، بدھ کی رات کو جمعرات کے لیے فیضی کو پھر سے چھٹی کا بخار چڑھ گیا۔

''افوہ! بخار کا تو بہانہ چل ہی نہیں سکتا! بھائی جان فوراً تھرمامیٹر لے کر دوڑ پڑتے ہیں۔'' وہ چڑ کر سوچنے لگا۔

''ہاں، سر درد کا آئیڈیا زبردست ہے! جمیل میرے سر کو کمر پر چڑھا نہیں سکتا! ابا جان میرے سر کا کھانا بند کرنے سے رہے؟ اور تو اور، سر درد کو تھرمامیٹر سے چیک نہیں کیا جا سکتا، ہاہاہا!'' فیضی نے خوشی سے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ایک کام یاب اسکیم پر اُس کا دل خوشی کے مارے بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ مزے سے ڈبل کمبل لپیٹ کر سو گیا۔

صبح ہوئی تو آپی پریشان تھیں۔

''لگتا ہے آج پھر بہت سا وقت ضائع ہونے والا ہے؟ میری چھٹی حس خبردار کر رہی ہے کہ ف سے فیضی، ف سے فساد پھیلا کر ہمارا بہت سا وقت ضائع کر دے گا۔ بالکل ضائع!''

آپی نے مردہ سی شکل بنا کر باجی سے کہا، جو جلدی جلدی پراٹھے پکا رہی تھیں اور آپی انڈے پھینٹ رہی تھیں۔

''فیضی کی اچھی خاصی بے عزتی ہو چکی ہے، مجھے نہیں لگتا کہ وہ اب مزید کوئی ڈرامہ کرے گا؟ اتنی ٹینشن لیتا ہے، اسکول جانا اس سے کہیں زیادہ آسان ہے!''

باجی نے کوفت سے کہا۔

''ہاں دیکھیں، اب وہ اپنے تمام اعضا کی بیماری کو کیش کرا چکا ہے، ہی ہی ہی..... مثلاً ٹانگیں، ہاتھ، پیٹ، منہ، بخار، سبھی کچھ، ہاہاہاہا!'' آپی کی ہنسی میں باجی کی ہنسی بھی شامل ہو چکی تھی۔ ابھی وہ فیضی کے لیے انڈا بنا ہی رہی تھیں کہ بھائی صاحب باورچی خانے میں گھس آئے اور اَخبار والے کی طرح اعلان کرنے لگے:

''آج کی تازہ خبر، صبح کی بالکل تازہ خبر!''

''کیوں شور کر رہے ہو؟ کیا ہوا ہے؟''

باجی نے جھنجھلا کر کہا۔

''تازہ خبر ہے، ہاہاہا!''

بھائی صاحب پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنس رہے تھے۔

''اسکول ''فوبیا'' سے متعلق ہی ہوگی؟''

آپی نے خصوصی دل چسپی لی۔

''کیا پھر فیضی کا کوئی نیا ڈرامہ!؟ یہ بھی ہار مانتا ہی نہیں۔ آج پھر کافی وقت ضائع ہوگا!''

باجی نے گھبرا کر کہا۔

''جی ہاں، دو کمبل لپیٹ کر گرم ہو گئے ہیں۔ جھوٹ موٹ کا بخار تو ثابت نہ کر سکے، مگر سر میں ان کے کافی ''شدید'' درد ہے!''

بھائی صاحب نے فیضی کے جیسا منہ بنایا اور تینوں کی ہنسی فوارے کی طرح ابل پڑی۔ ہنسی کی آواز قریبی کمرے میں بھی سنی جا چکی تھی، لہٰذا فیضی نے چیخ کر اِحتجاج کیا:

''امی دیکھیں! تینوں میرا مذاق اڑا رہے ہیں!''

''بیٹے میں تمھارا سر دبا دیتی ہوں، پھر تم اٹھ کر تیار ہو جاؤ، ناشتا لگنے تک تیاری کر لو!'' امی نے اس کے احتجاج کو نظر اَنداز کر کے کہا۔

''امی! اگر کسی کے سر میں اتنا درد ہو تو وہ خاک پڑھائی کر سکے گا؟''

اس نے رونی صورت بنالی۔

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹے! مگر حاضر ہو کر اِنسان کچھ نہ کچھ تو پڑھ ہی لیتا ہے!'' امی نے کہا۔

''مگر ایسی پڑھائی سمجھ میں تو نہیں آسکتی؟ جب آپ اسکول جاتی تھیں تو کبھی آپ کے سر میں بھی درد ہوتا ہی ہوگا؟ پھر آپ کیا کرتی تھیں؟ اسکول کی چھٹی ہی کرتی ہوں گی نا!؟''

فیضی نے خود سوال کر کے خود ہی جواب دیا اور اپنی طرف سے خاصی مضبوط دلیل پیش کی۔ امی مسکرا دیں۔

''درد تو ہوتا ہی نہیں تھا۔ بھلا بچوں کو بھی کوئی اتنی بیماریاں ہوتی ہیں کیا!؟ اگر کبھی کوئی چھوٹی موٹی تکلیف ہو بھی جاتی تھی تو تمھاری نانی دوا کھلا کر مجھے اسکول بھیج دیا کرتی تھیں۔'' امی نے بتایا۔

''یعنی آپ چاہتی ہیں کہ یہ ظلم نسل در نسل چلتا رہے؟ سردی کی وجہ سے اِنسان کے سر میں درد تو ہوتا ہی رہتا ہے نا!؟'' فیضی نے احتجاج کیا۔

''اچھا میں تمھارے ابا جان سے پوچھتی ہوں۔''

امی اٹھ گئیں اور فیضی دعا کرنے لگا کہ امی کو جو دلائل اس نے بتائے

ہیں ان سے ابا جان بھی قائل ہو جائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ابا جان اس کی تکلیف سے بے چین ہو کر فوراً ہی اس کی طبیعت پوچھنے اس کے کمرے میں آ گئے۔ انھوں نے فیضی کے سر پر ہاتھ پھیرا، سات مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر پھونکی، پھر بولے:

''میرے بیٹے کو جو بیماری ہوگئی ہے اس کی مختلف شکلیں اسے بہت ہی پریشان رکھتی ہیں، میں اپنے سب سے پیارے اور چھوٹے بچے کو اتنی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ اب اس کا علاج ضروری ہو گیا ہے، تاکہ بیماری جڑ سے ختم ہو سکے۔'' ابا جان نے بڑی ہمدردی سے کہا۔

''ابا جان؟ مم..... مجھے..... کیا کوئی خطرناک بیماری ہوگئی ہے؟''

فیضی کو معلوم تھا کہ وہ جھوٹ بول بول کر بیمار بن جاتا ہے، مگر ابا جان نے جتنی ہمدردی اور فکر سے اس کی عیادت کی تھی وہ اس سے بُری طرح سٹپٹا کر اُٹھ بیٹھا تھا۔

''ابا جان! کیا آپ مجھے ہسپتال لے جائیں گے؟''

''نہیں بیٹے! اس کا علاج تو پانی سے ہی ہو جائے گا! پانی بہت زبردست دوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پانی ایک ایسی نعمت دی ہے کہ آکسیجن کے بعد یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔''

ابا جان نے پیار سے کہا تو فیضی اداس ہو گیا۔ اب ابا جان پھر سے سونف، الائچی یا پانی کا کوئی اور ٹوٹکہ مجھے پلانے والے ہیں! اس نے دل میں سوچا۔

''کیا بہت زیادہ پانی استعمال کرنا پڑے گا ابا جان!؟'' اسے تشویش ہو رہی تھی۔

''نہیں! بہت زیادہ تو نہیں ہوگا!'' ابا جان سوچتے ہوئے بولے۔

''ابا جان! سردی میں سونف وغیرہ کا پانی ٹھنڈ چڑھا دیتا ہے۔ میں ابلا ہوا سادہ پانی ہی لوں گا ذرا سا!'' فیضی نے رائے دی۔ ''بل کہ آپ مجھے گولیاں منگوا دیں، میں وہ گولیاں بیڈ کے نیچے..... مم..... میرا مطلب ہے گلے کے نیچے پانی سے اتار لوں گا!''

''نہیں بیٹا! کسی قسم کا کوئی رنگین پانی نہیں، بالکل صاف شفاف سادہ پانی دوں گا آپ کو!''

''پھر ٹھیک ہے ابا جان!''

وہ خوش ہو گیا۔ ابا جان نے اسے چلنے کی زحمت نہ دی، بل کہ کمر سے پکڑ کر اُٹھایا اور غسل خانے میں لے گئے۔ پٹڑے پر بٹھا کر اُس کا سر دُھلا دیا۔ پانی کافی ٹھنڈا تھا، فیضی کی چیخ برآمد ہوئی، مگر ابا جان کا کہنا تھا کہ پانی ہر طرح کی تکلیف کے لیے ''اکسیر'' ہے۔ ابا جان کا یہ کہنا بھی تھا کہ فیضی کا سر، سردی میں شاید پریشر ککر بن جاتا ہے اور گرمی میں ''سرد'' ہو کر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے، چناں چہ وہ چھٹی پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جب سے ابا جان نے پانی سے ہر بیماری کا علاج شروع کیا ہے اسکول کے اوقات میں فیضی کو کبھی بھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی، اس لیے کہ سرد موسم میں عام نلوں کے پانی سے اور گرمی میں گرم پانی کر کے ابا جان ''پانی'' ہی کے ذریعے ہر موسم میں فیضی کا علاج شروع کر دیتے ہیں، چناں چہ اب فیضی ''مکمل'' صحت یاب ہو چکا ہے۔

KIO's

Collection shoes

New Arrivals
Now At Store

ذوق وشوق
میگزین ساتھ لانے
پر اسپیشل
10%
ڈسکاؤنٹ

اسکول شوز ہر سائز میں۔۔۔ چھے ماہ کی گارنٹی کے ساتھ۔۔۔

Shop No. 9, Star Centre, Near Chawla Centre,
Main Tariq Road Karachi. Ph: 021-34315359

NEW OPENING
HAND BAGS
20% OFF

She shoes

New Arrivals
Now At Store

Shoes for ladies and kids

10% OFF
ON ALL DISPLAY
ITEMS
LIMITED TIME OFFER

SCHOOL SHOES & PT SHOES
AVAILABLE ONLY 790/=

FANCY CLUTCH
& WALLET

ذوق وشوق
میگزین ساتھ لانے
پر اسپیشل
10%
ڈسکاؤنٹ

Shop No. 14-15, Lavish Mall, Opp. Rabi center,
Main Tariq Road, Karachi. Tel.: 0213-4547778, 0213-34327331

کوپن برائے
بلاعنوان ۱۶۵

نام: ______ ولدیت: ______
مکمل پتا: ______
فون نمبر: ______

کوپن برائے
ذوقِ معلومات ۶۴

نام: ______ ولدیت: ______
مکمل پتا: ______
فون نمبر: ______

سوال آدھا ۲۰ جواب آدھا

نام: ______ ولدیت: ______
مکمل پتا: ______
فون نمبر: ______

کوپن برائے
قرآن کوئز ۹

نام: ______ ولدیت: ______
مکمل پتا: ______
فون نمبر: ______

مقابلۂ خوش خطی ۸

نام: ______ ولدیت: ______
مکمل پتا: ______
فون نمبر: ______

ہدایات: جوابات ۳۱ مئی، ۲۰۲۱ء تک ہمیں موصول ہوجانے چاہییں...... ☆ ایک کوپن ایک ہی ساتھی کی طرف سے قبول کیا جائے گا......

☆ کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہونے والے جوابات قرعہ اندازی میں شامل نہیں کیے جائیں گے۔

پیارے بچوں کے لیے
پیاری کتابیں
سچی دوستی
جنت کا دروازہ
چہکتی چڑیا
مسکراہٹ نگر
نئی کہانی نیا انداز
صرف ایک عمل
سنت کہانی
مکتبہ بیت العلم
17 الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
+92-321-4361131 ، +92-42-37112356
فدا منزل، نزد مقدس مسجد، اردو بازار کراچی۔
+92-312-3647578 ، +92-21-32726509
ای میل: mbikhi.pk@gmail.com، ویب سائٹ: www.mbi.com.pk

سلسلہ

تحفۃ الدعاء

دعا عظیم نعمت اور انمول تحفہ ہے، دعا اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس سے راز و نیاز کا ذریعہ ہے، دعا مایوسی میں امید کی کرن ہے، دعا کے ذریعے ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام مسائل حل کروا سکتے ہیں، اس دنیا میں کوئی بھی انسان کسی بھی حال میں دعا سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

اسی فکر کے پیشِ نظر "مکتبہ بیت العلم" نے تحفۃ الدعا سیریز کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! اس سیریز کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں۔

MaktabaBaitulilm

بیت العلم

Karachi Ph : 021-32726509
Lahore Ph : 042-37112356
www.mbi.com.pk